اپریل 2002

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

شہر میں اُردو بولنے والوں کا ایک سیمپل سروے اُردو مرکز عظیم آباد نے گذشتہ دنوں کرایا جس کے مطابق اُردو آبادی کے:

- 87 فی صد لوگ اُردو پڑھنا جانتے ہیں
- 77 فی صد اُردو لکھنا جانتے ہیں
- 59 فی صد اُردو میں خط لکھتے ہیں
- 85 فی صد لوگوں کے گھروں میں اُردو میں خط آتے ہیں
- 42 فی صد لوگ اُردو اخبار پڑھتے ہیں
- 34 فی صد لوگ اُردو کے رسالے خرید کر پڑھتے ہیں
- 61 فی صد لوگ ٹیلی ویژن پر اُردو خبریں دیکھتے ہیں
- 38 فی صد اُردو والوں کے بچے اُردو پڑھتے ہیں
- صرف 3 فی صد لوگ دفتروں میں اُردو میں درخواستیں دیتے ہیں

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی واعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی اردو کونسل کے ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ انڈیا انٹر نیشنل سینٹر میں 14؍مارچ کو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مسز بیلا بنرجی (جوائنٹ سکریٹری لینگویجز)، جناب اپا منیو چٹرجی (ڈائرکٹر لینگویجز) اور جناب ٹی آر پرساد (ڈیسک آفیسر لینگویجز)

اس میٹنگ میں (دائیں سے) جناب من موہن شرما، پروفیسر سیّد جعفر رضا، جناب محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

ماہنامہ
اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔4، شمارہ۔4: اپریل 2002

قیمت -/10روپے سالانہ -/100روپے

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
معاون مدیر: ارجمند آرا

مشیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ تعلیم۔ حکومت ہند

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110
فون: 6103381، 6103938
6108159 فیکس 6179657
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.com
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد
دہلی۔110006

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون:6109746

شاخ: 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدرآباد 001 500 (A.P.)
فون:4615139

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... خطوط 2

ہماری بات ..... اداریہ 5

انگریزی میڈیم نظام تعلیم میں اردو (گیسٹ کالم) ..... محمد اقرار حسین 6

● ہندستان میں ریاستی سطح پر اردو آبادی کا جائزہ ..... اے آر فتیحی 7

● اترانچل میں اردو ..... راشد جمال فاروقی 8

● بہار میں اردو کی صورت حال ..... م۔ ش۔ استھانوی 9

● رضاکار تنظیمیں اور اردو تعلیم کے مسائل ..... احمد سجاد 11

● اردو اخبارات میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال ..... میر بدر الدین علی 13

● چین میں تصوف ..... شکیل الرحمان 15

● پبلک سیکٹر ـــ معاشی اصلاحات کے دور میں ..... سید اطہر رضا بلگرامی 17

● انسانی کلوننگ اور اخلاقی اقدار کا تصادم ..... ٹائمز آف انڈیا 21

● بزدلی کا ڈر نہیں ..... اسپائک ملیگن تیمن 23

گوشۂ ادب

● اٹھارہ سو ستاون کی کہانی مرزا غالب کی زبانی (آخری قسط) ..... مرزا غالب 25

گوشۂ فروغ کتب

● لکھنؤ کا محرم الحرام (فسانۂ آزاد، جلد اوّل سے اقتباس) ..... رتن ناتھ سرشار 28

● مولانا آزاد کے دو بڑے سیاسی کارنامے (اقتباس) ..... رشید الدین خاں 31

طلبہ کے لیے

● میٹرک سے ماسٹرس ڈگری تک اسکالر شپ ..... سلمان عابد 35

● صحافت میں کیریئر ..... عبدالنور شبلی 39

● مائکرو سافٹ ورڈ ..... عظیم صدیقی 41

● قبائل (کوئز) ..... ملک راشد فیصل 46

اطلاقی تنقید: نئے تناظر ـــ رپورتاژ ..... شہزاد انجم 49

اُردو خبر نامہ ..... ادارہ 55

تبصرہ و تعارف ..... کتابوں پر تبصرے 72

● انسانی شخصیت کے اسرار و رموز / ساجدہ زیدی ..... مبصر: فیروز عالم

● اُردو زبان کی تدریس / معین الدین ..... مبصر: ابو ظہیر ربانی

● محمد عثمان عارف نقشبندی: ایک مطالعہ / محمد زماں عارف ..... مبصر: انور کمال حسینی

● ادراکِ معنی / محمد نفیس حسن ..... مبصر: محمد نعیم

● ابابیلیں لوٹ آئیں گی / ترنم ریاض ..... مبصر: وسیم بیگم

● درسِ حیات / منظور عثمانی ..... مبصر: انور علی ایڈوکیٹ

● چند عام بیماریاں / اتل اگروال ..... مبصر: ایس اے رحمن

● ماہنامہ "امکان" / ملک زادہ منظور احمد ..... مبصر: مخمور سعیدی

● حصار / نصرت رشید ● سونے کا محل / انور کمال حسینی

بچوں کا گوشہ

● اختر کی پنسل ..... عطا عابدی 78

آپ کی بات

■ امین بنجارہ، 267، جوگی گیٹ، جموں-180001

"اردو دنیا" کا تازہ شمارہ اپنی پیشانی پر پروفیسر آلِ احمد سرور کی جاذب نظر تصویر اور اُن کے فرمودات کے اقتباسات سجائے باصرہ نواز ہوا۔ آہ سرور!

مرحوم نے اُردو زبان و ادب اور اردو کلچر کی بقا کے لیے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر، محقق، مدرّس اور اقبال شناس ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنی فکر اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا اور بہت عمدہ کیا۔ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ فعال، متحرک اور جواں خیال تھے۔

اپنے دوستوں کی زیادہ تعریف کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی اچھا کام کرنے والوں کی لیکن کیا کیا جائے رہا بھی نہیں جاتا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے آپ نے جو خوشگوار ماحول، سازگار فضا اردو اور اردو والوں کے لیے تیار کی ہے، اُس کے مثبت اثرات ایک لمبے عرصے تک قائم رہیں گے۔ اکیسویں صدی، اردو انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی ثابت ہوگی اور اس میں آپ کا اور قومی اردو کونسل کے دیگر اہلکاروں کا اہم کردار ہوگا۔

■ ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی، "نکھار پبلی کیشنز" دوما پورہ، مئو ناتھ بھنجن

ماہنامہ "اردو دنیا" بابت فروری 2002 باصرہ نواز ہوا۔ حسبِ سابق یہ شمارہ بھی کافی پرکشش اور باوقار ہے۔ ہماری بات کے تحت آپ نے اپنے ادارتی شذرے میں جن تعلیمی امور کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یقیناً اہمیت کے حامل ہیں اور اس جانب فوری اور موثر اقدامات کے طلب گار۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے مسلم ہے کہ لسانی اور علاقائی ضرورتوں کے پیش نظر ہمیں تعلیم کے معاملے میں پوری سرگرمی کا ثبوت دیتے ہوئے مضبوط پلاننگ اور منصوبہ بندی کے تحت سرکار کی تعلیمی فروغ کی اس کوشش میں پوری معاونت کرنی چاہیے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم شور زیادہ کرتے ہیں اور عمل کم۔ ہماری کم عملی بلکہ بے عملی کے پس پردہ سرکاریں اور سیاسی جماعتیں اپنی بے عملی کو چھپا لیتی ہیں۔ تعلیم کا تمام تر تعلق ملک و قوم اور نئی نسل کی تعمیر و ترقی سے ہے اس لیے ہمیں اس معاملے میں کسی قسم کی سیاسی مصلحت کوشی کو راہ نہ دے کر خالص قومی جذبے کے تحت اپنی فعالیت کا ثبوت دینا چاہیے، خصوصاً فعال افراد اور رضاکار تنظیموں کو آگے بڑھ کر تعلیم کے فروغ کی اس قومی کوشش میں اپنی ذمے داری نبھانی چاہیے۔

جہاں تک تعلیم سے متعلق آئینی اصول و ضابطے کا معاملہ ہے ہمارے آئین میں 6 سے 14 سال تک کی عمر کے بچوں کی لازمی تعلیم کے لیے آرٹیکل 45 میں پوری وضاحت کردی گئی ہے اور ریاستی سرکاروں کو یہ ذمے داری دی گئی تھی کہ آئین کے نفاذ سے دس سالوں کے اندر 6 سے 14 سال تک کے بچوں کے لیے مفت لازمی تعلیم کا انتظام کریں۔ مگر آئین کے نفاذ کے 50 سال سے زائد عرصے میں ہماری سرکاروں نے اپنی کتنی آئینی ذمے داری نبھائی ہے، یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں میں ریاستی سرکاروں نے جو کام نہیں کیا اس سے دامن بچانے کے لیے 93واں ترمیمی آئینی بل پاس کر کے ساری ذمے داری ریاستی سرکاروں سے ہٹا کر والدین پر ڈال دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ والدین جو اپنی مفلسی اور غریبی کے سبب بچوں کو نہیں پڑھا پاتے ہیں، بچوں کے اسکول جانے سے ان کے ہونے والے معاشی خسارے کی ذمے داری بھی سرکار کو لینی چاہیے اور اسکول اور تعلیم کے معقول انتظام کا بھی بندوبست کرنا چاہیے۔ تعلیم کی ذمے داری صرف والدین کے سر ڈالنا، ان کے ساتھ خصوصاً غریب اور مفلوک الحال والدین کے ساتھ زیادتی ہے اس لیے اس بوجھ کو مل جل کر بانٹنا چاہیے۔ 1949 میں ریاستی وزرائے تعلیم کی میٹنگ میں جونیر بیسک سطح تک بچوں کی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کی بات کہی گئی تھی اور ماہرینِ تعلیم کا یہی فیصلہ بھی ہے کہ بچوں کی ابتدائی اور ثانوی سطح تک تعلیم ان کی مادری زبان میں ہونی چاہیے مگر اس کا کیا ہوا؟ ہماری ریاست اترپردیش میں تو سہ لسانی فارمولے کا چہرہ ہی مسخ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم کے لیے ایسی عددی شرائط لگادی گئیں کہ عمل درآمد ناممکن ہوگیا۔ اس تناظر میں تعلیم اور ذریعۂ تعلیم کو کسی طرح بھی مشروط کرنا غیر مناسب ہے۔

مذکورہ شمارے میں گیسٹ کالم میں اطہر فاروقی کے انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ "اردو ذریعۂ تعلیم کی حمایت میں"، ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کا مضمون "اردو ذریعۂ تعلیم اور عصری تقاضے"، سید شہاب الدین کا مضمون "فروغِ اردو اور دیگر اقلیتی زبانیں" اہم اور معلوماتی مضامین ہیں۔ یہ خصوصاً اردو تعلیم اور ذریعۂ تعلیم کے بارے میں کئی اہم امور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ حسین الحق کا مضمون "صحافتی زبان کے بدلتے روپ"، سید فضل اللہ مکرم کا رحم علی الہاشمی کی فنِ صحافت پر لکھی گئی کتاب پر تبصرہ، شمشاد حسین کا "طلبہ میں انتشار۔ ایک نفسیاتی تجزیہ" کے علاوہ مرزا غالب

کے روزنامچے "دستنبو" (مخمور سعیدی صاحب کے ترجمے کی چوتھی قسط) وغیرہ مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔

■ **حلیمہ سعدیہ، ہمدرد پبلک اسکول، سنگم وہار، نئی دہلی**

ماہ فروری کا رسالہ نظر نواز ہوا۔ پوری اردو دنیا کی خبروں سے چند گھنٹوں میں واقفیت ہو گئی۔

آپ نے "ہماری بات" میں بجا فرمایا کہ تعلیمی تحریک میں پورے ملک کو شامل ہونے کی ضرورت ہے جس میں عوام اور انتظامیہ دونوں کو ایک ہی سمت میں آگے بڑھنا ہوگا۔ آج ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہم حکومت اور انتظامیہ کو بلدی سے لے کر ہینگ تک کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں اور بسااوقات عوام کی کمزوریوں سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرتے ہیں۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت عوام کو تعلیم کی اہمیت وافادیت سے واقف کرا کے انھیں تعلیم کی طرف راغب کرنا ہے، خاص طور سے اقلیتی طبقے کو۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اب بھی راجدھانی دہلی میں رہنے والے ایسے افراد موجود ہیں جو اپنے بچوں کو محض اس لیے پڑھنے نہیں بھیجتے کہ وہ دو چار پیسے کمانے میں ان کی مدد کریں گے۔ پچھلے دو سالوں سے ہمدرد پبلک اسکول نے سلم (Slum) کے غریب بچوں کے لیے "گلشن ہمدرد" کے نام سے مفت تعلیم کا انتظام کیا ہے جس کے تحت انھیں یونیفارم، کتابیں اور دوپہر کا کھانا بھی مفت دیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کی پوری ذمے داری اسکول اٹھاتا ہے اور اگر Sponser مل جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ ذہین طلبہ اسکول کے mainstream نظام میں داخل کر لیے جاتے ہیں۔ ان بچوں کو سنگم وہار لانے کے لیے اساتذہ کو کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ والدین اپنے بچوں کو پڑھنے بھیجنے کے روادار نہیں ہوتے۔ ہفتوں جاکر انھیں سمجھانا پڑتا ہے۔ مختلف مثالوں سے ان کے ذہن کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیجیں۔

جس جگہ اب بھی عوام کی یہ سوچ ہو وہاں تو ناخواندگی کے خلاف جہاد چھیڑنے کی ضرورت ہے۔ یہ حال صرف سنگم وہار میں ہی نہیں ہے، ہر جگہ سلم کے علاقوں میں یا جھگیوں میں یہی حال ہے۔ ہم پڑھے لکھے لوگوں کا فرض ہے اپنے آس پاس کے علاقوں پر نظر رکھیں اور جہاں بھی یہ صورتِ حال نظر آئے وہاں پہنچ کر لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کریں اور ملک گیر پیمانے پر اس مہم کو آگے بڑھائیں۔ اس کے لیے ہمیں میدانِ عمل میں کودنا ہوگا کیوں کہ "باتوں سے کوئی کام بنا ہے نہ بنے گا۔"

اطہر فاروقی اور رفیق زکریا صاحب کے خیالات سو فی صد سچائی اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ اگر ہم اردو کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو اردو میڈیم اسکولوں میں انگریزی کے معیار کو بلند کرنا ہوگا تاکہ ان اسکولوں کے طلبہ معاشی میدان میں پیچھے نہ رہیں اور کسی قسم کے احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔ ساتھ ہی انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو بحیثیت مضمون کا Option دستیاب ہونا چاہیے۔ اس کو والدین کے اوپر اگر ہم نے چھوڑ دیا تو کام نہیں چلے گا کیوں کہ میرا خیال ہے کہ ہمارے والدین اور سرپرست اتنے متحرک اور فعال نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اگر قومی اردو کونسل کچھ کوششیں کر سکے تو ایک بہت بڑا کارِ خیر ہوگا۔ خدا آپ کی کوششوں کو شرفِ قبولیت بخشے (آمین)۔

■ **شاہین سہسرامی، محلہ شیخ پورہ، سہسرام (رہتاس)**

اردو دنیا، فروری 2002 میں "اٹھارہ سو ستاون کی کہانی مرزا غالب کی زبانی، کی چوتھی قسط پیشِ نظر ہے۔ صفحہ 35 پر مرزا یوسف کی موت کے ذکر کے سلسلے میں غالب کے ایک قطعہ تاریخ کا ترجمہ بھی مرقوم ہے، جس کے مطابق ایک شخص نے جب غالب سے مرزا یوسف کا سالِ وفات پوچھا تو غالب نے ایک آہ کھینچی اور کہا۔ "دریغ دیوانہ" اس مادۂ تاریخ کی توضیح یوں کی گئی ہے کہ "حسبِ قاعدہ دریغ دیوانہ کے 1290 عدد شمار ہوں گے۔ ان میں سے آہ کے عدد، جو 16 ہوں گے، گھٹا دینے کے بعد 1274 باقی رہ جاتے ہیں جو مطلوب ہیں۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ بحسابِ جمل دریغ دیوانہ کے اعداد 1290 تو صحیح ہیں لیکن آہ کے عدد 16 نہیں بلکہ صرف 6 محسوب ہوں گے۔ چنانچہ بہ اصولِ تخرجہ 1290 میں سے 6 کا عدد نکال دینے کے بعد 1284 بچ رہتا ہے جو درست نہیں۔ لہٰذا گمانِ غالب یہ ہے کہ غالب نے دراصل "دریغ دوانہ" کہا ہے، جس کے اعداد 1280 ہوتے ہیں اور 6 کا عدد کم کر دینے سے 1274 برآمد ہوتا ہے جو مرزا یوسف کا سالِ وفات ہے۔ لیکن کاتب نے دوانہ کو دیوانہ کر دیا اور یہ نقص دستنبو میں در آیا۔

بہرحال مخمور سعیدی صاحب کی یہ علمی کاوش بہت خوب ہے جس کے لیے وہ بلاشبہ تحسین و آفریں کے مستحق ہیں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ "دستنبو" کا ترجمہ آپ توجہ سے دیکھ رہے ہیں۔ "دریغ دیوانہ" کی توضیح میں کمپوزر کی غلطی سے "آہی" کی جگہ صرف "آہ" چھپ گیا ہے اس لیے آپ کو الجھن ہوئی۔ "آہی" کے عدد سولہ ہوں گے جو گھٹا دینے کے بعد 1274 ہی باقی بچتے ہیں۔ دراصل یہاں اصل فارسی مصرعہ :

کشیدم آہی و گفتم دریغ دیوانہ

دے دینا چاہیے تھا۔ آپ کا تجویز کردہ لفظ "دوانہ" رکھ دینے سے مصرعے کا وزن برقرار نہیں رہے گا۔ (م۔س)

■ کے. راما راؤ، حیدر آباد۔

حیدر آباد کے مشہور روزنامہ "منصف" میں "اردو دنیا" پر تبصرہ پڑھ کر فوراً نام پلی دفتر سے فروری کا شمارہ خریدا۔ رسالہ نہایت دلکش ہے۔ معذورین کے لیے تعلیم اور روزگار کا مضمون نہایت کار آمد مضمون ہے۔ طلبہ میں انتشار پر مضمون والدین اور مدرسین کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ البتہ نظم، غزلیات اور افسانوں کی کمی محسوس کی۔ آپ کی بات میں رشمی صاحبہ (آگرہ) کے مراسلے سے میں بالکل متفق ہوں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے تاجر اپنے اشتہاروں میں اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دیتے ہیں اور مذہبی اعتقاد کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔

■ مست حفیظ رحمانی، جنرل سکریٹری، بزمِ اردو، سیتاپور، یوپی

جنوری کے شمارے میں اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، ہم اردو کیوں پڑھیں، اردو میلے کی تفصیلی رپورٹ، اردو کانفرنس کا ذکر، مختلف علاقوں میں اردو کے سلسلے میں ہونے والے پروگراموں کی رپورٹیں پڑھیں۔ یہ سب لائقِ ستائش ہیں۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے یہ بار بار کہا جاتا رہا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ سیاست دانوں نے اردو کو صرف مسلمانوں سے جوڑ دیا ہے۔ مسلمانوں نے اسے صرف شاعروں اور ادیبوں کی زبان تسلیم کرلیا ہے اور شاعروں ادیبوں نے معاش کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔ مدارس میں اردو زندہ ضرور ہے لیکن زبان اچھے ادب کے ذریعے ترقی کرتی ہے صرف حروف شناسی سے نہیں۔ اس لیے ہر ضلع کی ادبی تنظیموں کو متحرک ہونا ہوگا۔ گذشتہ دنوں بزمِ اردو سیتاپور نے انجمن ترقی اردو شاخ سیتاپور اور اردو رابطہ کمیٹی کے تعاون سے 15روزہ اردو بیداری مہم چلائی تھی جس میں 83افراد نے اردو میں دستخط کرنے سیکھے جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ عوام سے بینر، پوسٹر، نیم پلیٹ اردو میں لکھوانے کی اپیل کی جو کچھ حد تک کارگر رہی۔ پھر بھی اسکولوں میں اردو کی پڑھائی کا مسئلہ ریاستی حکومت کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی سرکاری اسکول میں اردو طلبہ کی تعداد کے مطابق اردو اساتذہ نہیں ہیں۔ گورنمنٹ انٹر کالج سیتاپور میں جہاں شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی تعلیم حاصل کر چکے ہیں، کئی برس سے اردو لیکچرر نہیں۔ ایک ہی ٹیچر درجہ 6سے انٹر تک اردو پڑھاتا ہے۔ اس طرح کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے جو حکومت کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

■ رضوان خان، شیخ سرائے، سیتاپور

جنوری 2002 کے سرورق پر دیا گیا شعر حالانکہ اس سے قبل بھی اُردو دنیا کے ایک شمارے کے سرورق کی زینت بن چکا ہے لیکن پھر بھی پسند آیا۔ آپ کی مساعی اس شعر سے پوری طرح مناسبت رکھتی ہیں۔ فروری 2002 کے شمارے میں سید فضل اللہ مکرم صاحب کا مضمون "فنِ صحافت پر پہلی کتاب" بہت عمدہ ہے۔ یہاں میں یہ ضمناً عرض کردوں کہ ہمارے ضلع سیتاپور کے مشہور صحافی صادق حسین صاحب مرحوم نے اردو صحافت کے بالکل شروعاتی دور میں "صبحِ صادق" نام کا پرچہ نکالا تھا۔

گیسٹ کالم میں اطہر فاروقی صاحب کا مضمون بھی لائقِ ستائش ہے۔ یو۔پی میں اُردو کی موجودہ حالت کے حوالے سے کوئی مضمون شائع فرمائیں جس میں Up to Date جانکاری ہو۔

■ کے اے زرتارگر، سابق چیئرمین انجمن ہائی اسکول، باگل کوٹ، کرناٹک

فروری کا شمارہ بڑی بے تابی سے پڑھا۔ اردو دنیا اپنی نوعیت کا واحد مجلّہ ہے، پڑھ کر طبیعت محظوظ ہوئی۔ معاً غالب کا شعر یاد آگیا:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

آپ کی محنت وکاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔

■ مظہر سلیمان، مرزا غالب لین، دربھنگہ

فروری کا "اردو دنیا" کل ہند اردو کانفرنس کی تصاویر سے رسالے کی خوبصورتی کو بڑھا رہا ہے۔ مضامین بھی اچھے اور معلوماتی ہیں۔ ڈاکٹر رفیق زکریا، سید شہاب الدین کے ساتھ ڈاکٹر سلمان عابد کے مضامین قابلِ ستائش ہیں۔ اس کے علاوہ اردو خبرنامہ سے ادبی سرگرمیوں کا پتا چلتا رہتا ہے۔ تبصروں سے بہت ساری نئی کتابوں کی تفصیل فراہم ہوتی ہے۔

□□□

سہ ماہی **فکر و تحقیق** نئی دہلی
(علمی و تحقیقی مجلّہ)
سالانہ خریدار خود بنیے اور دوسروں کو بھی خریدار بننے کی ترغیب دیجیے
زرِ سالانہ : صرف -/100روپے
ملنے کا پتا : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم۔ نئی دہلی-110066

ہماری بات

قومی تعلیمی مشن کے پروگرام بالعموم دو طرح کے ہیں جن کے لیے اردو میں روایتی اور غیر روایتی تعلیم کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اسکول سطح کی تعلیم یعنی دسویں درجے تک کی تعلیم کو روایتی طریقِ تعلیم کے دائرے میں رکھا جاتا ہے حالانکہ اب اس کی بھی کئی غیر روایتی شقیں ہیں جن میں مراسلاتی طرزِ تعلیم کا نیشنل اوپن اسکول سرفہرست ہے۔ قومی تعلیم کے غیر روایتی تصور کے مطابق حکومت کی متعدد اسکیمیں ایسی ہیں جن کا مقصد پہلی سطح پر خواندگی کا دائرہ بڑھانا اور دوسری سطح پر خواندہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانا ہے۔ سرو شکشا ابھیان (سب کو ابتدائی تعلیم) کے تحت 2002-2003 کے مالی بجٹ میں 1650 کروڑ روپے حکومتِ ہند نے مختص کیے ہیں۔ اس کے تحت 6 سے 14 سال تک کی عمر کے بچوں کو ابتدائی تعلیم فراہم کرنے کا ضلعی سطح پر انتظام کیا جائے گا۔ آئین کی 93ویں ترمیم کے نفاذ کے لیے پانچ سالہ قومی منصوبے کے خطوط کا بھی تعین ہو رہا ہے، یعنی آئندہ پانچ برسوں میں تعلیم کے نئے تناظرات ابھریں گے اور حکومت ان کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم بھی مہیا کرائے گی۔ تعلیم کے ان منصوبوں میں اردو تعلیم کی توسیع کے در بھی وا ہوں گے، یہ بات تو طے ہے لیکن ابھی اس بات کا قطعی تعین کرنا مشکل ہے کہ ضرورت کے پیشِ نظر نئے تناظر میں قومی تعلیمی مشن کے ماڈل کیا ہوں گے، کتنی نئی اسکیمیں تیار کی جائیں گی اور پرانے ماڈلوں میں کیا تبدیلی رونما ہوگی۔

اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو کے حالات میں خوشگوار تبدیلی رونما ہو رہی ہے جس کے مختلف زاویے پرائمری اور ثانوی سطح کی تعلیم سے لے کر روزمرہ میں، خصوصاً ترسیل و ابلاغ میں اردو کے استعمال کو محیط ہیں۔ حکومت کی تعلیم سے متعلق نئی پالیسیوں میں بھی اردو کی نمائندگی بڑھ رہی ہے اور امید ہے عمومی تعلیم پر ہونے والے خرچ میں اردو کو اپنا حصہ اس وقت اپنے آپ مل جائے گا جب تعلیم کی نئی اسکیمیں لاگو ہوں گی۔

اردو والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ وقت رہتے ایسا لائحۂ عمل متعین کریں جس سے نئے تعلیمی منصوبوں کا فیض اردو تعلیم کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ اردو آبادی کو پہنچ سکے۔ اردو تعلیم کے ادارے کھولنے کے لیے مناسب حکمتِ عملی اختیار کرنے کے علاوہ اردو تعلیم کے سیاق و سباق میں سب سے اہم کام ہر سطح پر نصاب سازی کا ہے جس کی طرف ہنوز سنجیدگی سے توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ تعلیم کے غیر روایتی طریقوں کی بات تو الگ رہی، روایتی یعنی اسکول سطح کے نصاب پر بھی بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ان سبھی اداروں کو ہے جن کے مقاصد میں اردو کا فروغ شامل ہے۔

اسکول سطح کی کتابیں بیشتر صوبوں میں مسلسل اپ ڈیٹنگ کے عمل سے نہیں گزرتیں۔ عام طور سے کتابیں تعلیمی سیشن کے آغاز میں دستیاب نہیں ہوتیں یا کئی صوبوں میں مجبوراً ایسی بھی کتابیں شاملِ نصاب کرنی پڑتی ہیں جن میں اس مخصوص صوبے کی سماجی زندگی، ثقافت اور تاریخ کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ صوبائی بورڈوں سے ملحق اسکولوں میں شامل نصاب کی تمام کتابیں اسی صوبے کے کسی نصاب ساز ادارے میں تیار ہونی چاہئیں۔ البتہ NCERT جیسے اداروں کی کتابیں CBSE اور ICSE جیسے بورڈوں سے ملحق اسکولوں میں چل سکتی ہیں۔ مگر ہر صوبے میں اسکولوں کی عمومی تعداد کا 90 فیصد حصہ صوبائی بورڈوں سے ملحق ہوتا ہے اس لیے NCERT جیسے ادارے کی کتابیں خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں، نصابی کتب فراہم کرنے کے مقصد کو صرف جزوی طور پر ہی پورا کر سکتی ہیں۔

دسویں پانچ سالہ منصوبے میں ہر سطح پر جاری تعلیم کے نئے پروگراموں میں بہتر اردو نصاب کی فراہمی کس طرح ہو، یہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ ان صوبائی حکومتوں میں جہاں اردو کی نمائندگی سرکاری سطح پر نہیں ہے یا بہت کم ہے، یہ چیلنج زیادہ ہی کٹھن ہو جاتا ہے کیونکہ اردو کے تعلیمی مفادات کی نگرانی کرنے والی کوئی مناسب ایجنسی وہاں نہیں ہوتی ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے ملک کے سب سے اہم مرکزی ادارے یا نوڈل ایجنسی کے طور پر قومی اردو کونسل کی ذمہ داریاں اس ضمن میں بہت بڑھ جاتی ہیں کہ وہ کس طرح مختلف صوبوں کے متعلقہ محکموں اور شعبوں سے رابطہ قائم کرکے اردو کے مفادات سے متعلق اسکیموں کے موثر نفاذ کی جانب ان کی توجہ دلائے۔ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کونسل کو نہ صرف مسلسل کوشاں رہنا ہے بلکہ متعلقہ اداروں سے روابط کو مضبوط کرکے نصاب سازی کی مانیٹرنگ بھی کرنی ہے۔ اس کام کے لیے کونسل مسلسل غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات کی جانب بھی توجہ دے رہی ہے۔

محمد حمید اللہ بھٹ

محمد اقرار حسین

گیسٹ کالم

انگریزی میڈیم نظامِ تعلیم میں اردو

بیسویں صدی کے آخری برسوں میں ملک میں اردو کے لیے جو مجموعی اور عمومی فضا ہموار ہوئی ہے وہ اردو والوں کے ان تبدیل شدہ حالات کا ثمرہ ہے جن میں اردو معاشرے میں اقتصادی طور پر نمایاں ہونے والے طبقات نے سیاسی حالات کے زیرِ اثر اپنی تہذیبی شناخت کو سخت خطرات سے دوچار پایا۔ سیاسی حالات کی حدت اتنی زیادہ تھی کہ شناخت کے اس کرائسس سے وہ اشرافیہ بھی نہ بچ سکا جو آزادی کے بعد خوف کی نفسیات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اردو تعلیم سے متعلق عجیب و غریب باتیں کر کے عام لوگوں اور حکومت دونوں کو گمراہ کرتا رہا تھا۔ توقع ہے کہ حالات کی مار کے سبب ہی سہی مگر اردو اشرافیہ کا یہ رویہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی جاگزیں کئی طرح کے وسوسوں کو نکال کر ان کی آئندہ نسلوں کے لیے اردو تعلیم کے حصول کی راہ ہموار کرے گا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہر اردو والا اردو سے بے پناہ محبت کرتا ہے مگر یہ حالات کی بے مہری تھی جس نے نہ صرف اردو اشرافیہ کو اردو تعلیم سے دور رکھا بلکہ اپنے بچوں کو اردو نہ پڑھانے کے لیے اس طبقے نے جو بودے استدلال دیے، ان کے نتیجے میں وہ عام اردو والوں کی نظروں میں سرکار کو اردو کے مسائل پر گمراہ کرنے کا موردِ الزام بھی قرار پایا۔ ایسا نہیں کہ اردو کے تئیں اپنے عجیب و غریب اور متضاد رویوں کی بے وقعتی کا اردو اشراف کو اندازہ نہ تھا مگر آزادی کے بعد اس کے سوا ان کے سامنے شاید کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔ اردو کے ساتھ وابستہ ایکسیلنس اردو اشرافیہ کو عدمِ اعتماد کے حصاروں سے نکال کر انھیں اپنے تشخص کے سب سے طاقت ور عنصر یعنی زبان کو اپنی شناخت بنانے میں معاون ہوگا۔ تعلیمی نظام میں اردو کی شمولیت زبان کے طور پر اردو کی حیثیت کو نئی جہات ہی عطا نہیں کرتی، نظامِ تعلیم میں اردو کے لیے تکنیکی اور عملی سطحوں پر امکانات کے نئے باب بھی وا کرتی ہے۔

وجوہ جو بھی ہوں مگر انگریزی ذریعہ تعلیم یا انگریزی کی اچھی استعداد معاصر زندگی کی ایسی ضرورتیں ہیں جن سے مفر ممکن نہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عملی طور پر انگریزی ذریعہ تعلیم سب کو میسر نہیں آسکتا اور یہ بھی صحیح ہے کہ جن لوگوں کو انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا وہ اب کسی ہندستانی میڈیم کو اختیار نہیں کریں گے۔ اردو ہی کیا، کسی بھی دوسری ہندستانی زبان کو بولنے والے اس کلیے سے مستثنا نہیں مگر اردو اشرافیہ نے انگریزی ذریعہ تعلیم کے معاملے کو اس طرح پیش کیا گویا یہ ارمغانِ تعلیم ہر اردو والے کے دروازے پر از خود دستک دے رہا ہے مگر اردو والے اس سے گریزاں ہیں، نیز انگریزی ذریعہ تعلیم میں اردو کے لیے کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ دلیل تعلیم اور سماجی و سیاسی حالات کے عدمِ عرفان کا نتیجہ تھی۔ انگریزی ذریعہ تعلیم میں، جو مکمل طور پر پرائیویٹ سیکٹر کے پاس ہے، کسی بھی زبان یا کسی بھی مضمون کی تعلیم کے لیے گنجائش نکالنا سب سے آسان کام ہے مگر یہ کام صرف والدین کے مطالبے پر ہو سکتا ہے جس کے لیے انھیں بعض اوقات کچھ زیادہ خرچ بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ پبلک اسکولوں کی حد تک انگریزی میڈیم میں پہلی زبان کے طور پر اردو کے مطالعے کے لیے گنجائش نکالنا بے حد سہل کام ہے۔ مگر جب والدین خود ہی اس کے خواہاں نہ ہوں تو اسکول کی طرف سے اس معاملے میں پیش رفت کی امید کرنا فضول ہے۔ تعلیم کے بازار میں آج کچھ بھی خریدا جا سکتا ہے اور والدین جس طرح کی تعلیم کا مطالبہ کریں گے اسکولوں کو اس کا انتظام کرنا پڑے گا۔ پھر جب پرائمری کے بعد اور سیکنڈری سطح تک ہر بچے کو تین زبانوں کا مطالعہ کرنا ہی ہے تو ان میں ایک زبان اردو کیوں نہیں ہو سکتی؟ تعلیم کے ماہر جانتے ہیں کہ عمومی حالات میں جو زبان بچے کا ذریعہ تعلیم ہوتی ہے اس پر اس کی گرفت سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے اور جو زبان ذریعہ تعلیم ہو اسے اگر علاحدہ سے زبانِ اوّل کے طور پر نہ بھی پڑھایا جائے تو کچھ قباحت نہیں۔ یعنی انگلش میڈیم اسکولوں میں چھٹی کلاس سے دسویں کلاس تک ان بچوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے، اردو زبانِ اوّل کے طور پر پڑھائی جا سکتی ہے، انگریزی زبانِ دوم کے طور پر اور ہندی + سنسکرت کا مشترک کورس زبان سوم کے طور پر۔ مگر یہ کام مشکل اس لیے ہے کہ اردو کی حد تک انگریزی میڈیم اسکولوں کو اس فارمولے کے نفاذ کا کوئی تجربہ نہیں کیوں کہ اردو والوں نے کبھی اس کا مطالبہ ہی نہیں کیا۔ تعلیمی پالیسی سازوں کا جب اردو کی تعلیم کے نظم کے سوال سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کے رونے کی بوالعجبی اس لیے دیدنی ہوتی ہے کہ انھیں اس سوال پر غور کرنے کے لیے کبھی مجبور ہی نہیں کیا گیا۔

مشکل جو درپیش ہے وہ یہ کہ ابھی خود اردو والوں نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ اردو کی حیثیت ان کے لیے کیا ہو اور جب تک خود اردو والے یہ فیصلہ نہ کریں، اس آسان کام کا بھی ہونا ممکن نہیں۔

□□□

Principal, Delhi Public School, Mathura Road,
Sunder Nagar, New Delhi-110003

اے آر فتیحی

ہندستان میں ریاستی سطح پر اردو آبادی کا جائزہ

مردم شماری کے اعداد و شمار کی روشنی میں

ملک کی ترقیاتی منصوبہ سازی کے لیے ضروری ہے کہ منصوبہ بنانے والوں کے پیش نظر ملک میں بسنے والوں کی تعداد، اس میں اضافے کی شرح، تعلیمی معیار اور دیگر تفصیلات سے صحیح واقفیت ہو۔ مردم شماری ان تفصیلات کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ ہمارے ملک میں ہر دس برس کے وقفے سے کی جاتی ہے۔ مردم شماری ملک کا سب سے بڑا سماجی، معاشی اور تعلیمی جائزہ ہے اور یہ ملک کی منصوبہ بندی کے لیے ناگزیر ہے۔

ملک میں چودھویں مردم شماری کا کام 2001 میں ختم ہو چکا ہے لیکن اس کی رپورٹ آنے میں ابھی سات آٹھ سال کا عرصہ لگے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر کونسل نے 1991 کی مردم شماری کے ان اعداد و شمار کو پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے جن کا تعلق اردو آبادی سے ہے۔ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور دوسرے اہم ترین فیصلے کیے جاتے ہیں اور ملک کی ترقی کے لیے پروگرام بنایا جاتا ہے۔

ریاست کا نام	کل آبادی	کل اردو آبادی	اردو آبادی فیصد میں	کل عورتیں	کل مرد	تناسب عورتیں : مرد	کل دیہی اردو آبادی	کل شہری اردو آبادی	تناسب دیہی:شہری
آندھرا پردیش	66508008	5560154	8.36	2723975	2836179	100 : 96	2205054	3355100	100 : 66
اروناچل پردیش	864558	1370	0.16	485	885	100 : 55	701	669	100 : 105
بہار	86374465	8542463	9.89	4113896	4428567	100 : 93	6947057	1595406	100 : 435
گوا	1169793	39944	3.41	18947	20997	100 : 90	10565	29379	100 : 36
گجرات	41309582	547737	1.33	264118	283619	100 : 93	49403	498334	100 : 10
ہریانہ	16463648	261820	1.59	122184	139636	100 : 88	239755	22065	100 : 1087
ہماچل پردیش	5170877	8252	0.16	3486	4766	100 : 73	5841	2411	100 : 242
کرناٹک	44977201	4480038	9.96	2186614	2293424	100 : 95	1779379	2700659	100 : 66
مدھیہ پردیش	66181170	1227672	1.86	591558	636114	100 : 93	195672	1032000	100 : 19
مہاراشٹر	78937187	5734468	7.26	2730061	3004407	100 : 91	1708100	4026368	100 : 42
منی پور	1837149	193	0.01	45	148	100 : 30	75	118	100 : 64
اڑیسہ	31659736	502102	1.59	244763	257339	100 : 95	306521	195581	100 : 157
پنجاب	20281969	13416	0.07	5354	8062	100 : 66	4874	8542	100 : 57
راجستھان	44005990	953497	2.17	461031	492466	100 : 94	151317	802180	100 : 19
تامل ناڈو	55858946	1036660	1.86	511161	525499	100 : 97	285039	751621	100 : 38
اتر پردیش	139112287	12492927	8.98	5907600	6585327	100 : 90	5777626	6715301	100 : 86
مغربی بنگال	68077965	1455649	2.14	641021	814628	100 : 79	345870	1109779	100 : 31

راشد جمال فاروقی

اُترّانچل میں اردو

نو تشکیل شدہ ریاست اترانچل تیرہ ضلعوں پر مشتمل ہے۔ جہاں 85 لاکھ سے زیادہ آبادی ہے۔ اس ریاست کا 64 فی صد حصہ پہاڑی ہے اور یہاں کی زمین کا بیشتر حصہ جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ پھل، ریشم، چائے، ادویاتی نباتات، بھیڑ پالن، بجلی کی پیداوار اور سیاحت جیسے میدانوں میں یہاں زبردست امکانات موجود ہیں۔ بے شمار خوبصورت گھاٹیوں، برف پوش چوٹیوں اور قابلِ دید مقامات کے علاوہ بدری ناتھ، کیدار ناتھ، گنگوتری، جنوتری، ہیم کنڈ، نانک متّا اور کلیر شریف جیسے مقدس مقامات بھی اترانچل کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یہاں شرح خواندگی اطمینان بخش ہے یعنی 72 فی صد لیکن اس خواندگی میں اگر اردو خواندگی تلاش کی جائے تو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اترانچل میں اردو کے لیے ماضی میں بھی کم گنجائش تھی اور اب ایسے وقت میں جب یہ زبان اپنے تاریخی دبستانوں میں بھی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو تو اس نومولود کوہستانی ریاست میں اس کے امکانات تلاش کرنا کوئی امید افزا عمل نہیں۔ ہر چند کہ دہرہ دون اور سوری دیوان سنگھ مفتوں اور قرۃ العین حیدر کی قیام گاہیں رہے ہیں لیکن وہ بات اب پرانی ہو چکی ہے۔ پہاڑوں پر زیادہ تر آبادی برہمنوں اور ٹھاکروں کی ہے۔ یہ لوگ گڑھوالی اور کمایونی بولیوں کو اپنی عام بول چال میں برتتے ہیں۔ تعلیمی سطح پر ہندی اور سنسکرت کے لیے یہ علاقہ ہمیشہ سے سازگار رہا ہے۔ مشہور ہل اسٹیشنوں مثلاً مسوری، نینی تال، رانی کھیت اور لینس ڈاؤن وغیرہ اپنے شاندار کانونٹ اور پبلک اسکولوں کے لیے جانے جاتے ہیں۔ یہاں انگریزی کی معیاری اور مہنگی تعلیم برٹش دور حکومت سے چلی آ رہی ہے۔

اردو صرف دہرہ دون، جوالا پور، رڑکی، منگلور، رام نگر اور ہلدوانی جیسے علاقوں میں مروج ہے مگر یہ رواج خاطر خواہ نہیں ہے۔ تھوڑی کوشش سے راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ پوری ریاست میں نہ سہی چند مقامات پر اردو کی حیات نو کے لیے کام کیا جا سکتا ہے ریاست کی راجدھانی دہرہ دون میں ہمیشہ اردو ادب کے متعلق کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا ہے۔ یہاں مشاعروں کی ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ نامی قادری اور ندیم برنی برسوں تک ایک معیاری ادبی رسالہ "ساز سرمدی" یہاں سے شائع کرتے رہے۔ انعام رحمٰی ایک رسالہ "تلاشِ لفظ" تقریباً اٹھارہ برسوں سے نکال رہے ہیں۔ سال میں ایک یا دو بار خصوصی اشاعت کے تحت ادبی مجلے کی شکل میں بھی یہ رسالہ نکلتا ہے۔ بزرگ شاعر جناب کنول ضیائی داغ اسکول کی زندہ روایت ہیں۔ ان کے فیض سے ایک وسیع حلقہ شعر و ادب سے منسلک ہے۔ موصوف کا شعری مجموعہ "لفظوں کی دیوار" ادبی حلقوں میں قدر و منزلت سے دیکھا گیا ہے۔ رڑکی سے مسیح الزماں امروہوی "گوشوارہ" نامی اخبار برسوں سے شائع کر رہے ہیں۔ اس شہر میں جناب انیس میرٹھی، اوم پرکاش ندیم اور قمر کہکشانی جیسے صاحبِ دیوان شعرا ہیں۔ افضل منگلوری مشاعروں کے حوالے سے ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔ براڈکاسٹر جناب رضا علی عابدی (بی بی سی اردو سروس) بھی رڑکی سے متعلق ہیں۔

جب اترانچل یوپی کا حصہ تھا تو یہاں مختلف ریاستی حکومتوں نے اردو ٹیچروں کے تقرر کیے تھے۔ ان میں سے بیشتر اساتذہ یوپی واپس جا چکے ہیں اور جو یہاں رہ گئے ہیں وہ اردو کی بجائے دیگر مضامین پڑھانے پر مجبور ہیں۔ اب اردو ٹیچروں کے تقرر کی امیدیں موہوم ہیں۔ چند گورنمنٹ انٹر کالجوں میں اردو ٹیچر تھے اور وہاں سے کچھ طلبہ یا طالبات اردو ایک مضمون کی حیثیت سے لے لیا کرتے تھے۔ گریجویشن کی سطح پر گڑھوال اور کمایوں دونوں یونی ورسٹیوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہ پہلے تھا، نہ اب ہے۔ انٹر تک اردو پڑھنے والے طلبہ طالبات اپنے شوق کی آبیاری کے لیے نزدیکی یونی ورسٹیوں مثلاً میرٹھ یا روہیل کھنڈ سے گریجویشن یا پوسٹ گریجویشن کر سکتے تھے، اب وہ آسانی بھی نہیں ہے کیوں کہ میرٹھ اور بریلی دوسری ریاست میں رہ گئے ہیں۔

آکاش وانی نجیب آباد اور رامپور نیز لکھنؤ دوردرشن پر ابھی تک اترانچل کے اردو شعرا و ادبا کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ بھی دیر تک چلنے والا نہیں کہ نجیب آباد، رامپور اور لکھنؤ یوپی میں ہیں۔ اترانچل میں آکاش وانی اور دوردرشن کے مراکز کھلنے پر اردو والوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا ہوگا ورنہ یہ در بھی بند ہو سکتا ہے۔ چند مصنفین اپنی کتابیں یوپی اردو اکادمی کے تعاون سے چھپوا لیتے تھے اب وہ سلسلہ بھی موقوف ہو سکتا ہے۔ صورتِ حال پہلے بھی امید افزا نہ تھی۔ یوپی سے علاحدہ ہو کر تو اردو والوں کے لیے فضا مزید ناسازگار ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں ایک اردو اکادمی کا قیام بے حد ضروری ہے، بجٹ خواہ برائے نام ہو۔ چھوٹے موٹے کام چلتے رہیں۔ اس سلسلے میں لوگ سربراہانِ حکومت سے ملتے رہے ہیں لیکن ہنوز شنوائی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ ہمت ہار کر بیٹھ جانے سے صورتِ حال مزید ابتر ہوگی۔ لہٰذا تحمل اور بردباری کے ساتھ اپنا جمہوری حق مانگنے کے لیے اردو والوں کو متحد ہونا چاہیے۔ کل ہند اردو تنظیموں کو بھی اس طرف توجہ کرنی چاہیے اور اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لانا چاہیے۔ □□□

A-1498, IDPL Township, Virbhadra (Rishikesh), Dehradun, Ulttaranchal-249202

م۔ ش۔ استھانوی

بہار میں اردو کی صورتِ حال

اردو کے نام پر تنظیموں کا قیام عام سی بات ہے۔ آزادی کے بعد نہ جانے کتنی تنظیمیں قائم ہوئیں اور کہاں دفن ہوگئیں، کوئی نہیں جانتا۔ آج ایسی تنظیموں کی اشد ضرورت ہے جو اردو کے لیے اپنی تحریک کو مثبت انداز فکر کے ساتھ جاری رکھیں۔ اردو کی ترقی کی راہ میں صرف حکومت ہی رکاوٹ نہیں بلکہ اردو کی نام نہاد تنظیمیں بھی ذمے دار ہیں اور خود اردو سے تعلق رکھنے والے افراد بھی۔ حکومت کے طرز عمل پر نالہ وشیون اور ماتم وگریہ کا اہتمام کر کے ہم دل کو تو بہلا سکتے ہیں مگر اردو کو بام عروج پر پہنچا نہیں سکتے۔ اس کے لیے خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم ذاتی طور پر اپنی سطح سے اردو کے لیے کوئی لائحہ عمل طے نہیں کریں گے اردو کو کوئی مقام نہیں مل سکتا اور نہ ہی اردو روزی روٹی سے جڑ سکتی ہے۔ البتہ سیاست سے اس کا رشتہ ضرور مستحکم ہو سکتا ہے اور آج یہی صورت حال حصول منصب اور کرسی اقتدار پر متمکن ہونے کے لیے مادری زبان اردو کو سیاست کے گلیاروں میں سے جا کر آوازیں لگانا عام ہے۔ ہم لوگوں کو اپنی سطح سے اردو کے لیے ضرور کوئی ٹھوس کارروائی کرنی چاہیے۔ اگر ہم اردو کو ترقی یافتہ زبان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں سرکاری دفاتر میں اردو میں درخواستیں دینی ہوں گی، خطوط پر اردو میں پتے لکھنے ہوں گے، دروازوں پر اردو میں اپنے نام کی تختیاں لگانی ہوں گی، دکانوں کے بورڈوں پر ہندی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کا بھی استعمال کرنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

عظیم آباد کی سرزمین پر اردو کی خدمت کے لیے پانچ برس قبل اردو مرکز عظیم آباد کا قیام عمل میں آیا۔ پانچ برسوں سے اردو مرکز اردو کی قابل قدر خاموش خدمت انجام دے رہا ہے۔ اردو مرکز کی طرف سے تقریباً 45 ادبا و شعرا کی کتابیں منصہ شہود پر آچکی ہیں۔ اردو مرکز نے دوسرا کارنامہ جو انجام دیا ہے وہ ہے "اردو آبادی کے درمیان زمینی سطح پر اردو کی صورت حال" کے موضوع پر سروے۔ اردو مرکز عظیم آباد نے پٹنہ شہر کی اردو آبادی کے تقریباً ڈیڑھ سو خاندانوں کا سروے کرایا ہے۔ دراصل ڈیڑھ سو خاندانوں کے اس سروے کو نمونے کا سروے ہی کہا جائے گا۔ اس سروے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو پڑھنے، لکھنے، اردو اخبار خریدنے، ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں سننے اور دیکھنے اردو خواندگی مراکز کا قیام اور ان میں جا کر اردو پڑھنے پڑھانے کا جذبہ اور شوق ہے یا پھر ان کا فقدان ہے۔ بلا تفریق ذات پات سروے کو معاشی اور تعلیمی اعتبار سے تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا طبقہ خوشحال، دوسرا متوسط اور تیسرا پسماندہ طبقہ ہے۔ سروے فارم کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (1) خواندہ جن کی پڑھائی جاری ہے (2) خواندہ، جنھوں نے پڑھائی بیچ میں چھوڑ دی اور (3) ناخواندہ لوگوں کے لیے۔

اس چھوٹے سے مضمون میں سروے کی تفصیلات کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا سروے فارم میں جو سوالات درج ہیں ان میں سے خاص سوالوں کو ہی یہاں پیش کیا جا رہا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ کتنے فیصد لوگوں نے مثبت جواب دیا۔

خواندہ جن کی پڑھائی جاری ہے

- کیا آپ کے گھر میں قرآن شریف ہے؟

150 خاندانوں میں سے 127 خاندانوں یعنی 84 فیصد کے پاس قرآن شریف ہے مگر 18 خاندان ایسے ہیں جن کے پاس قرآن شریف نہیں ہے۔ بقیہ نے جواب دینے سے معذوری ظاہر کی۔

- کیا آپ کے گھر میں مذہبی کتابیں ہیں؟ ہیں تو کس رسم الخط میں؟

اس سوال کے جواب میں 77 فی صد لوگوں نے کہا کہ اردو عربی میں کتابیں ہیں۔

- کیا آپ اردو پڑھنا جانتے ہیں؟

اس کا جواب 87 فی صد لوگوں نے ہاں میں دیا۔

- کیا آپ اردو لکھنا جانتے ہیں؟

77 فی صد لوگوں کا جواب ہاں میں ہے۔

- کیا آپ اردو میں خط لکھتے ہیں / لکھتی ہیں؟

اس کا جواب 59 فی صد لوگوں نے ہاں میں دیا۔

- کیا آپ کے گھر میں اردو میں خط آتے ہیں؟

85 فی صد لوگوں نے اس کا جواب ہاں میں دیا۔

- کیا آپ سرکاری دفتروں میں اپنی درخواستیں اردو میں لکھتے / لکھتی ہیں؟

اس کا جواب بہت ہی افسوسناک ہے۔ صرف 3 فی صد لوگوں نے جواب ہاں میں دیا ہے۔

- کیا آپ اردو اخبار پڑھتے ہیں / پڑھتی ہیں؟

42فی صد لوگوں کا جواب ہاں میں ہے۔

- کیا آپ اردو کا ادبی پرچہ خریدتے ہیں / خریدتی ہیں؟

اس کا جواب 34فی صد لوگوں نے ہاں میں دیا ہے۔

- کیا آپ اپنے اسکول کالج میں اردو کی پڑھائی سے مطمئن ہیں؟

62فی صد لوگوں نے اس کا جواب ہاں میں دیا ہے۔ جہاں اس کا جواب 100فی صد ی ہاں میں ہونا چاہیے تھا لیکن 38فی صد کا جواب منفی ہی رہا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے اساتذہ پڑھائی میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔

- کیا آپ اردو خواندگی مرکز کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں 94فیصد لوگوں نے حامی بھری اور خواندگی مرکزی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس کے قیام پر زور دیا۔

- کیا آپ ٹیلی ویژن پر اردو میں خبریں دیکھتے ہیں؟

61فی صد لوگ ٹیلی ویژن پر اردو میں خبریں دیکھتے ہیں۔ اس جواب سے ان حضرات کو ضرور تحریک ملے گی جو ٹیلی ویژن پر اردو خبروں کے وقت کی ترمیم یعنی 10 منٹ کے بجائے 15 منٹ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

- کیا آپ ریڈیو پر اردو خبریں سنتے ہیں؟

40فی صد لوگوں نے اس کا مثبت جواب دیا۔

- کیا آپ ٹیلی ویژن پر اردو پروگرام دیکھتے ہیں؟

اس کے جواب میں 61فی صد لوگوں نے حامی بھری۔

- کیا آپ ریڈیو پر اردو پروگرام سنتے ہیں؟

38فی صدی کا جواب ہاں میں رہا۔

- کیا آپ اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں / چاہتی ہیں؟

اس اہم سوال کے جواب میں 150 خاندانوں کے 86فی صد لوگوں نے اردو کو زندہ رکھنے کے بات کی۔

- آپ نے کس میڈیم میں پڑھائی کی؟

اس سوال کا جواب بہت ہی مایوس کن رہا۔ صرف 25فی صد لوگوں نے اردو میڈیم کی بات کی۔ بقیہ 75فی صد میں انگریزی اور ہندی شامل ہے۔ لہٰذا ہمدردان اردو کو چاہیے کہ جگہ جگہ اردو خواندگی مرکز قائم کر کے اردو کے فروغ میں عملی تعاون کریں۔ اردو کی ترقی ہم سب کی ترقی ہے۔

خواندہ، جنھوں نے پڑھائی بیچ میں ہی چھوڑ دی ہو

- کیا آپ کے پاس اردو میں کتابیں ہیں؟

اس سوال کے جواب میں 84فی صد لوگوں نے مثبت جواب دیا۔

- کیا آپ آگے اردو پڑھنا لکھنا سیکھنا چاہتے / چاہتی ہیں؟

اس سوال کے جواب میں 84 فی صد لوگوں نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے اردو پڑھنے لکھنے کا شوق جتایا۔

- کیا آپ اپنے اپنے علاقے میں اردو خواندگی مرکز کھولنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں / کرتی ہیں؟

اس سوال کا 95فی صد لوگوں نے حوصلہ افزا جواب دیا۔

ناخواندہ لوگوں کے لیے

- کیا آپ اپنے علاقے میں اردو خواندگی مرکز کھولنے کی ضرورت محسوس کرتے / کرتی ہیں؟

100فی صد ناخواندہ لوگوں کا جواب اردو خواندگی مرکز کھولنے کی حمایت میں ہے۔

اس کے لیے اردو سے محبت کرنے والوں کو مثبت قدم اٹھانا چاہیے تاکہ اردو خواندگی مرکز کھول کر ناخواندگی کا خاتمہ کیا جا سکے اور علم کی شمع روشن کی جا سکے۔

- کیا آپ خود اردو سیکھنا چاہتے ہیں / چاہتی ہیں؟

اس سوال کے جواب میں 63فی صد لوگوں کا جواب ہاں میں رہا۔

- کیا آپ کے بچے اردو پڑھتے ہیں؟

صرف 38فی صد لوگوں کا جواب ہاں میں ہے۔ یہ جواب بھی مایوس کن ہی ہے۔ جب کہ حوصلہ افزا بات تو یہ ہوتی کہ 100فی صد لوگ مادری زبان سے اپنے بچوں کو روشناس کراتے۔ اگر 100فی صد نہیں تو کم از کم 80فی صد تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ حکومت نے اپنے اعلان میں یہ بات کہی ہے کہ جس اسکول میں 10 طالب علم اردو پڑھنے والے ہوں گے وہاں ایک اردو ٹیچر ضرور بحال ہوگا۔

(بہ شکریہ قومی آواز، نئی دہلی 23دسمبر 2001)

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا

پروفیسر اختر اورینوی

اس کتاب میں 1204 سے 1857 تک بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کا منظر نامہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس دور کے سبھی اہم شاعروں اور نثر نگاروں کے تذکرے کے علاوہ ان کی نظم و نثر کے نمونے بھی شامل کتاب ہیں۔

ڈیمائی، 347صفحات، قیمت 18روپے

احمد سجاد

رضاکار تنظیمیں اور اردو تعلیم کے مسائل

مشہور ہے کہ عصر حاضر کے جمہوری نظام کا چوتھا ستون پریس یا میڈیا ہے مگر اب ان میں سے ایک پانچویں مستحکم ستون "رضاکار تنظیموں" (NGOs) کا اضافہ ہو چکا ہے کہ ان کے اور حکومتِ وقت کے باہمی تعاون و تعامل کے بغیر کسی صحت مند جمہوری نظام کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس تناظر میں اردو آبادی کی تعلیمی اور اقتصادی خوشحالی و ترقی کا اگر سرکاری سطح پر کوئی پروگرام بنایا جاتا ہے تو اردو والوں کی ان رضاکار تنظیموں (NGOs) کی شرکت ایک لازمی امر ہے، کیوں کہ تنہا سرکاری مشینری موجودہ ماحول میں کافی نہیں ہے۔ واضح ہو کہ حصولِ آزادی کے بعد تمام سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی سروے کا لبِ لباب یہ ہے کہ اردو آبادی ہندستان کی سب سے غریب اور غیر تعلیم یافتہ آبادی بن چکی ہے۔ اس لیے ان کا بنیادی مسئلہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم سے انھیں آراستہ کرنا ہے۔ جدوجہد آزادی کے دوران برطانوی سامراج کا سامنا کرنے میں سیاسی پارٹیوں کے علاوہ رضاکار تنظیموں کا رول بڑا بنیادی بلکہ فیصلہ کن رہا ہے۔ ان کی دو صد سالہ مربوط تاریخ اور مستحکم روایات رہی ہیں۔ مسلم یونی ورسٹی، ہندو یونی ورسٹی، دیوبند اور ندوہ وغیرہ کی تاریخ اس کی مثالیں ہیں۔

یوں تو تعلیم اور معاشی خوشحالی کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے مگر علمی دھماکے اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی وغیرہ کے نتیجے میں اوپن مارکیٹ اور گلوبل ولیج کے تصور نے تعلیم اور روزگار کو مترادف الفاظ میں تبدیل کر دیا ہے۔ لہٰذا تعلیمی منصوبہ سازی کے وقت ان دونوں کے مربوط ارتقا کا لائحۂ عمل مرتب کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ان دونوں کی علیحدگی ہی نے سچ پوچھیے تو عالمی پیمانے پر نئی نسل کو اپنے مستقبل سے مایوس، ردِ عمل کا شکار اور سماج دشمن یا دہشت گرد بنادیا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں حکومتِ وقت نے اردو تعلیم اور زبان و ادب کی ہمہ گیر توسیع و ترقی کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کو اردو کی نوڈل ایجنسی قرار دے کر نیز رضاکار تنظیموں کے اشتراک و تعاون سے ایک سو سے زائد کمپیوٹر سینٹر قائم کر کے ایک اہم ترین اقدام کیا ہے جس کی ملک گیر پیمانے پر تحسین کی جارہی ہے۔ کروڑوں کی اردو آبادی والے ملک میں اسے فی الحال ابتدائی قدم ہی کہا جائے گا۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کامیاب ابتدائی قدم کو اردو آبادی کی آزمودہ اور معروف رضاکار تنظیموں کے تعاون و تعامل سے ہمہ جہت اور ملک گیر بنایا جائے اور قومی کونسل کے اس تجربے کو توسیع دی جائے جس کی عملی صورت گری میں ذیل کے چند نکات بہ طور خاص قابلِ غور ہو سکتے ہیں۔

(1) دہلی، ممبئی، چنئی اور کلکتہ میں اردو اور اردو آبادی کی تعلیم و ترقی سے عملی دلچسپی رکھنے والی رضاکار تنظیموں کو جدید تعلیمی تناظر میں بعض موضوعات پر ہوم ورکس کے ساتھ سہ روزہ ورک شاپ / سیمینار میں مدعو کیا جائے۔

(2) ان رضاکار تنظیموں کو NOS کے AI نیز مولانا آزاد یونی ورسٹی کے اسٹڈی سنٹرز قائم کرنے کے لیے ضروری مالی اعانت مہیا کرائی جائے تاکہ ان میں اردو میڈیم کے جونیر سے سینئر اسکول (+2) تک کی تعلیمی و فنی تربیت اور خواہشمند طلبہ کو اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کا نظم کیا جاسکے۔

(3) حکومتِ وقت اگنو (IGNOU) کو ہدایت دے کہ ملک کی بعض علاقائی زبانوں میں اس کے کورس جس طرح چل رہے ہیں اسی طرح اردو میں ان علوم و فنون کو جلد از جلد منتقل کر کے اردو آبادی والے علاقوں میں بھی اس کے اسٹڈی سنٹرز قائم کیے جائیں۔

(4) اقلیتی مالیاتی کمیشن، قومی اقلیتی کمیشن، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن وغیرہ اور دیگر سرکاری و فلاحی اداروں کی گرانٹس میں اضافہ کیا جائے تاکہ اردو تعلیم کے فروغ و توسیع میں اردو ادارے مختلف انداز سے استفادہ کرسکیں۔

(5) یہ نہایت خوش آئند بات ہے کہ 6 سے 14 سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا حق قانونی طور پر منظور کیا جاچکا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ابتدائی سے ثانوی سطح تک مادری زبان اردو میں مفت مگر معیاری تعلیم کے لیے اسکول قائم کیے جائیں۔

(6) حکومتِ ہند نے اسکولوں کو اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی جو اسکیمیں ملک گیر پیمانے پر چلا رکھی ہیں ان سے اردو اسکولوں کو بھی جوڑا جائے۔ اس ضمن میں مختلف النوع اردو سافٹ ویئرز تیار کرائے جائیں،

● یہ مضمون قومی اردو کونسل کی سہ روزہ کل ہند اردو کانفرنس منعقدہ 21-19 دسمبر 2001 کو چن مایا مشن، نئی دہلی میں پڑھا گیا

بالخصوص ڈاٹا بیس اردو پیکج کی فوری ضرورت ہے۔

(7) ریاست وار یا علاقہ وار اردو کے لیے کام کرنے والی رضاکار تنظیمیں اردو تعلیم و تدریس کے میدان میں متفقہ نصاب اور امکانی حد تک ان کے متفقہ نظم و انصرام کے لائحۂ عمل پر غور کریں۔

(8) اردو کے لیے کام کرنے والی رجسٹرڈ رضاکار تنظیموں کو اپنی اپنی ریاست میں تعلیم اور روزگار سے جڑے ہوئے سرکاری محکموں اور شعبوں میں نمائندگی دی جائے۔

(9) ملک کی دو رجسٹرڈ رضاکار تنظیمیں جو قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹرز چلا رہی ہیں، اگر ان کی کارگزاری معیاری ہے تو انھیں Up Grade کر کے BIT & ADIT کورس وغیرہ چلانے کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

اردو رسم الخط، اردو کی ابتدائی تعلیم اور نئی تعلیمی پالیسی

ایک اختیاری مضمون کے طور پر اردو کی تعلیم اور اردو ذریعہ تعلیم دو مختلف صورتیں ہیں اور دونوں ہی پیچیدہ ہیں۔ ان پر کام نہیں ہوا، سوچا نہیں گیا، سیمینار نہیں ہوئے، حکومت سے مطالبہ نہیں کیا گیا۔ وہ جو قانونی الجھاوے ہیں ان کی تسہیل نہیں کی گئی۔ سہ لسانی فارمولے اور دستورِ ہند کی مختلف شقوں کے مطابق سمجھا ہی نہیں گیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

رسم الخط کا دفاع اور اس کا پھیلاؤ محض کتب و رسائل خریدنے سے وابستہ نہیں ہے۔ ابتدائی سطح پر جب تعلیم کا انتظام ہی نہیں ہوگا تو پھر نئی نسل کو زبان سے، شعر و ادب سے کیا دلچسپی ہوگی۔ ابتدائی سطح پر اردو تعلیم اور اردو ذریعہ تعلیم پر توجہ ہی نہیں کی گئی۔ پرائمری اور سکنڈری لیول پر پورے ہندستان میں اردو درس و تدریس کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں کوئی عملی تحریک شروع ہی نہیں کی گئی جبکہ آزادی کے پچپن سال بعد اردو بہ حیثیت تحریری زبان کے سمٹتی جا رہی ہے۔ صرف بول چال کی حد تک اردو ہندستانی کی موجودگی کو بھی ہندی کی ایک شیلی کے طور پر مانا جاتا ہے۔

اسکولی سطح پر اردو کی باقاعدہ تعلیم کے بغیر اردو زبان کا احیا ہندستان میں ممکن نہیں اور اس ایک بنیادی سوال سے بہت سارے سوال جڑ جاتے ہیں جن پر غور کرنے اور پھر عمل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ہمیں ضرورت ہے اردو تعلیم پر ایک نئے ڈسکورس کی کیونکہ آئین کی 93ویں ترمیم (93rd Amendment) کے مطابق 6 سال سے 14 سال تک لازمی تعلیم کی ذمہ داری حکومت کا فرض بن گئی ہے اور اب حکومت دس ہزار کروڑ روپے سالانہ ہندستانی زبانوں کے میڈیم پر خرچ کرے گی۔ یہ نئی تعلیمی پالیسی جسے "یونیورسل ایجوکیشن" کا نام دیا گیا ہے، اردو والوں کے لیے ایک نادر موقع ہے۔

اس وقت ہندستان میں اردو صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ 1991 کی مردم شماری کے مطابق 15 کروڑ مسلمانوں میں سے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کی زبان اردو تھی۔ ابھی 2001 کی مردم شماری کی رپورٹ آنا باقی ہے۔ یقیناً یہ تعداد بڑھی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ ہندی والے صوبوں میں مسلمانوں کی مادری زبان اردو کے بجائے ہندی لکھے جانے کی شکایتیں بہت رہی ہیں۔ غیر ہندی علاقوں کا بھی یہی حال ہے۔ مگر کیا یہ ساڑھے چار یا پانچ کروڑ مسلمان اردو کو بطور ذریعہ تعلیم اپنائے ہوئے ہیں؟

آزادی سے قبل اردو زبان، مشترکہ تہذیب و تمدن کی اہم اور بڑی زبان تھی چنانچہ اس کے لکھنے پڑھنے والوں میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی شامل تھے لیکن آج یہ صورتِ حال ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں شاذ ہی کوئی ہندو طالب علم داخلہ لیتا ہو۔ خود اردو والے اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے تعلیم دلوانے میں گریز کرتے ہیں اور یقیناً اس کی غیر جذباتی وجوہ بھی ہیں جن پر غور نہیں کیا گیا۔

پورے ہندستان میں اردو بہ حیثیت ایک اختیاری مضمون کے یا پھر اردو ذریعہ تعلیم کا نفاذ اب بھی ممکن ہے اور پرائمری، سکنڈری سطح پر نئی تعلیمی پالیسی کے تحت یہ کام ہو سکتا ہے۔ الجھاوے بہت ہیں، مسائل بھی بہت ہیں۔ رسمی اور غیر رسمی تعلیم، مردم شماری میں اردو بہ حیثیت مادری زبان لکھوانے والوں میں ناخواندگی کی شرح، اردو نصاب، سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں اردو بہ حیثیت مضمون، اردو اساتذہ کا تقرر، اردو اسکولوں کا معیارِ تعلیم، اسکولوں کا Adoptation، سہ لسانی فارمولہ اور اس میں گھٹتا ہوا اقلیتی زبانوں کا مقام مثلاً دہلی سرکار کے حالیہ فیصلے کے مطابق ابتدائی سطح پر انگریزی لازمی زبان ہو جائے گی، ہندی تو پہلے ہی سے لازمی زبان ہے۔ پھر اردو کہاں؟ جبکہ دہلی کی دوسری سرکاری زبان اردو بھی ہے۔

("شاعر"، ممبئی، مارچ 2002 کے اداریے سے ماخوذ)

میر بدرالدین علی

اردو اخبارات میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال

اردو اخبارات کو جدید ترین انفارمیشن ٹیکنالوجی سے آراستہ اور مزین کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے اور یہ مشکل ہر گزرتے دن کے ساتھ اس ٹیکنالوجی میں روز افزوں ترقی کی وجہ سے گویا بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اس معاملے میں ایک اور مشکل یہ ہے کہ دو تین اخبارات کے سوا باقی تمام اخبارات کے ذمے دار حضرات اس سلسلے میں سخت پس و پیش اور اندیشوں کا شکار ہیں، جو بنیادی طور پر اس جدید ٹیکنالوجی سے ان کی عدم واقفیت اور معلومات کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ چند اخبارات نے خود کو اردو کمپیوٹر کتابت تک محدود کر رکھا ہے تو چند ایک نے صرف انٹرنیٹ یا فیکس کی سہولت پر اکتفا کیا ہے۔ اس پس و پیش کا ایک اہم سبب وہی قدیم مسئلہ یعنی آمدنی کے بے حد محدود وسائل ہیں۔ آمدنی اور مالیے کی کمی کی وجہ سے بھی اخبار کے مالکان کوئی ایسا قدم اٹھانے سے خود کو مجبور اور معذور محسوس کرتے ہیں جس میں کوئی کثیر خرچ انھیں برداشت کرنا پڑے۔ لیکن ان تمام اندیشوں اور پس و پیش کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو اخبارات کو جدید ترین انفارمیشن ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنا بہت ضروری ہے کیوں کہ اس اقدام سے اردو زبان کی بقا اور اس کی وسعت کا سوال کچھ نہ کچھ حد تک وابستہ ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کے دائرے میں ٹھوس اقدامات کرنا ضروری ہیں۔

آج انفارمیشن ٹیکنالوجی نے جس رفتار سے ترقی کی ہے اس کے مقابلے میں اردو کی ترقی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔ اردو اخبارات کو اور اردو زبان کے دوسرے قابلِ نشر مواد کو جدید ترین کمپیوٹرنیک اور سافٹ ویئر ٹیکنالوجی سے آشنا کرنے کے لیے اور سافٹ ویئر کو ترقی دینے اور اسے جدید ترین بنانے کی جانب توجہ جتنی دینی چاہیے وہ ابھی نہیں دی گئی ہے۔ اس کے برخلاف آج دیگر زبانوں میں ہمہ قسم کے سافٹ ویئر اور ملٹی میڈیا استعمال کیے جارہے ہیں۔ ان ملٹی میڈیا سہولتوں کے استعمال کی گنجائش اردو سافٹ ویئر ٹیکنالوجی میں صفر کے برابر ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال میں اردو زبان کس قدر پیچھے رہ گئی ہے۔ انٹرنیٹ پر اور آن لائن اردو زبان کو پہنچانے کے لیے اردو کا اپنا کوئی انٹرنیٹ سلیوشن پر اویڈنگ سافٹ ویئر ابھی تک تیار نہیں ہوا ہے جس کی وجہ سے انٹرنیٹ پر اردو اخبارات و رسائل یا کتابیں پیش کرنے کے لیے دوسرے سافٹ ویئر کا سہارا لے کر انٹرنیٹ کی وسیع دنیا تک رسائی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یہ بالواسطہ طریقۂ کار جو امیج کہلاتا ہے، ایک طرح سے فرسودہ طریقہ بن چکا ہے کیوں کہ یہ صرف ارسال تک محدود ہے اور اس سے کوئی انٹرنیٹ یا آن لائن استعمال کرنے والا عملی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اردو کے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ظاہر ہے کہ ایک جدید ترین سافٹ ویئر کی تیاری درکار ہے۔ اس شعبے میں وپرو اور انفوسس نے کچھ قدم بڑھائے ہیں اور سافٹ ویئر تیار کیا ہے۔ لیکن اس سافٹ ویئر اور متعلقہ امور پر اتنا کثیر خرچ آتا ہے کہ اردو اخبارات اپنی کمزور مالی پوزیشن کی وجہ سے اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ یہ مسئلہ فوری توجہ ہی نہیں فوری اقدام چاہتا ہے۔ جس کے لیے این سی پی یو ایل اور وزارت فروغِ انسانی وسائل کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔

ایک مسئلہ اردو اخبارات کے معیار میں اضافے اور بہتری کا ہے تاکہ اردو اخبارات بھی، کسی قدر ہی سہی، عالمی معیار حاصل کریں اور انٹرنیٹ اور آن لائن کے قارئین کے لیے کشش اور دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ فی الوقت اکثر اردو اخبارات اپنے بجٹ کے اندر صرف ایک نیوز ایجنسی پر ہی انحصار کرتے ہیں اور یہ سروس یو این آئی کی اردو سروس ہی ہے۔ لیکن اس اردو سروس کے بھی حدود ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی ہی انگریزی سروس کی ساری خبریں فراہم نہیں کرسکتی اور پھر یہ سروس جب خالص اردو داں برادری کی دلچسپی کی خبریں دیتی ہے مثلاً ہرچرن چاؤلہ کی وفات، معین احسن جذبی کو اعزاز، این سی پی یو ایل کے اردو کتاب میلے کی روزانہ روداد۔ اس طرح تو اس کی فراہم کردہ خبروں کی تعداد میں اور کمی آجاتی ہے۔ اس اردو سروس کو عالمی سطح پر صرف رائٹر کا تعاون حاصل ہے نتیجتاً دوسری بین الاقوامی نیوز ایجنسیوں کی فراہم کردہ خبروں سے محرومی رہتی ہے۔ بلاشبہ یو این آئی اردو سروس کے اپنے مسائل اور مشکلات ہیں لیکن یہی وہ سروس ہے جس سے ہم اردو اخبارات کی ہی نہیں اردو زبان کی بھی ملک گیر خدمت کی امید کرسکتے ہیں۔ اگر اردو ٹیلی پرنٹر سے خبروں کی ترسیل کی موجودہ تکنیک کو بہتر بنالیا جائے تو وہ انگریزی سروس کے برابر خبریں فراہم کرسکتی ہے اور یہ بھی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اردو داں افراد کو چند اہم معلومات بھی فراہم کرسکے گی، مثلاً معاشی سروے، مالیاتی مسائل، اسٹاک ایکس چینج کی صورتِ حال، بجٹ

● یہ مقالہ قومی اردو کونسل کی سہ روزہ کل ہند اردو کانفرنس منعقدہ 21-19 / دسمبر 2001 میں پڑھا گیا۔

کی نزاکتیں وغیرہ۔ ان چیزوں کی اشاعت اگر اردو اخبارات میں پابندی سے ہو سکے تو ان کی قدر اور اہمیت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور وہ یقیناً انٹرنیٹ اور آن لائن قارئین کو متوجہ کر سکیں گے، جس سے یہ بھی امید کی جا سکتی ہے کہ اردو اخبارات کو اشتہارات بھی مل جائیں گے جو ان کی کمزور معاشی حالت کو کچھ استحکام عطا کر سکیں گے۔ بہر حال اردو اخبارات کو جدید ترین انفارمیشن ٹیکنالوجی سے مزین کرنے اور ان کا معیار اور وقار بڑھانے کے لیے ایک ابتدائی قدم کے طور پر یو این آئی اردو سروس کو مضبوط اور موثر بنایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد تکنیکی ماہرین کے مشورے سے دیگر اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔

Editor "Salar" Daily,
Al Ameen Tower,No. 69, Hosur Road,
Near Lal Bagh Main Gate, Bangalore-560027

□□□

قومی اردو کونسل کی نئی کتاب شائع ہو گئی ہے

URDU : Readings in Literary Urdu Prose

by

Gopi Chand Narang

A Text for Students with An Elementary Knowledge of Urdu

(قیمت : 100 روپے)

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔1، ونگ نمبر۔6، آر. کے. پورم، نئی دہلی110 066

شکیل الرحمان

چین میں تصوف

سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک وسط ایشیا پر عجمی تہذیب و تمدن کے اثرات مسلسل ہوتے رہے ہیں۔ وسط ایشیا کی وسیع اور پھیلی ہوئی سرزمین پر اسلامی تہذیب کی مسلسل آمیزشیں ہوتی رہیں۔ فنونِ لطیفہ اور خصوصاً ادبیات میں ان کے نقوش نمایاں ہوئے، چنگیزی اور ازبک قبیلوں کے تصورات اور نظریات کی آمیزش سے ایک وسیع نظامِ جمال کی تشکیل ہونے لگی، اسلامی دنیا میں یہ اپنی نوعیت کی انتہائی خوبصورت تمدنی آمیزش ہے۔ سیاسی اور ثقافتی پہلو متاثر ہوئے، مغل اور صفوی تمدنوں نے دانشورانہ سطح پر نئی فکر و نظر اور نئی اقدار کی تشکیل شروع کی۔

آویزش اور آمیزش اور خیالات اور تجربات کے ردّ و قبول کے اس ماحول میں تصوف کا ظہور ہوتا ہے اور پھر صوفیوں کی گہری فکر و نظر اور تصوف سے فکری اور دانشورانہ سطح پر ایک خوبصورت روشنی پھیلتی ہے، دل چھو لینے والی خوشبو ملنے لگتی ہے۔ نقشبندی سلسلے کا انتہائی گہرا اثر ہوا۔ یہی نقشبندی سلسلہ ہندستان پہنچا اور برِصغیر میں اس سلسلے کے کئی ممتاز صوفیائے کرام نے وحدت الوجودی آہنگ کے تئیں بیدار کیا۔ خالقِ کائنات اور انسان کے اُس رشتۂ ازلی کے تئیں چوکنا کیا جو عشق و محبت کا رشتہ ہے۔ صوفیوں نے اللہ اور انسان کی محبت کو ہمیشہ عزیز تر رکھا اور اسے طرح طرح سے بیان کیا۔ دوسرے صوفی سلسلوں کی طرح نقشبندی سلسلہ بھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کر خالقِ کائنات کا براہِ راست تجربہ حاصل کرنا چاہیے، حضور کریمؐ نے فرمایا تھا کہ جب عبادت کرو تو اس طرح کہ تم ہر لمحہ محسوس کرتے رہو کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ ممکن نظر نہ آئے تو یہ محسوس کرو کہ وہ تمھیں ہر لمحے دیکھ رہا ہے۔" (احسان) حضور کریمؐ کا یہ ارشاد تصوف کی روح اور اس کے بنیادی جوہر کی جانب اشارہ ہے۔

جب مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور تمدنی زندگی میں زوال آنے لگا تو اسلامی تصوف میں سلسلوں کا آغاز ہوا۔ بارھویں صدی میں مسلمانوں کی اخلاقی قدریں شکستہ ہو رہی تھیں۔ سماجی زندگی عجب طرح سے بکھر رہی تھی، روح اپنی توانائی کھو رہی تھی، منگول تصوف اور صوفیانہ فکر و نظر کے سامنے ایک چیلنج بن گئے تھے۔ صوفیوں نے حالات کی نزاکتوں کو دیکھتے ہوئے روح کی توانائی کی بازیافت کی جانب توجہ دی۔ وہ منگول جارحیت کا جواب روح کی توانائی سے دینا چاہتے تھے۔ بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی سماجی زندگی میں اخلاقی اقدار و تصورات کی نئی تشکیل ہو۔ وسط ایشیا کی فکری اور تمدنی زندگی پر جن صوفیائے کرام کے خیالات اور تجربات کے گہرے اثرات ہوئے اُن میں حضرت امام بصریؒ (728) حضرت ابراہیم بن ادھمؒ (777) حضرت ابوحسن عثمانؒ، حضرت رابعہ بصریؒ (901) حضرت امام الغزالیؒ (1111) حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (1234) حضرت شیخ محی الدینؒ ابن اعرابی (1248) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (1166) حضرت خواجہ احمد (1166) (حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ انھیں پیر ترکستان کہتے تھے) اور حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند (1389) وغیرہ کے نام بہت ہی ممتاز ہیں، نقشبندی سلسلے کے بانی ہیں۔ حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ (1490) اسی سلسلے کے ایک روشن چراغ ہیں کہ جنھوں نے نقشبندی سسلے کو عوام کے دل و دماغ تک لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس زمانے کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وسط ایشیا کے صوفیوں نے خانقاہیں قائم کیں اور انہیں تمدنی، تہذیبی، علمی اور سماجی مراکز کی حیثیت دے دی۔ یہ خانقاہیں کچھ ہی عرصے بعد ٹوٹتی ہوئی قدروں کی نئی تشکیل میں نمایاں حصہ لینے لگیں، علوم کی روشنی بڑی شدت سے پھیلی، خواجہ محمد پارساؒ (1420) اور خواجہ عبیداللہ احرار (1490) دونوں نقشبندی سلسلے کے بڑے صوفی تھے جنھوں نے خانقاہوں اور تیموری شہزادوں کے درمیان ایک انتہائی عمدہ رشتہ قائم کر دیا جس کی وجہ سے فضاؤں کی تبدیلی میں بڑی مدد ملی۔

صوفیائے کرام کے تجربوں کی روشنی اور خوشبو اور خانقاہوں کی پاکیزگی اور طہارت سے چین بھی متاثر ہوا۔ چین کی آبادی کا ایک حصہ مسلمان ہوا۔ یہ بتانا آسان نہیں ہے کہ قبولِ اسلام کا سلسلہ چین میں کب سے شروع ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ تصوف سے متاثر ہوا جس نے نقشبندی سلسلے کو عزیز رکھا۔ سترھویں صدی سے پہلے چینی مسلمانوں نے تصوف پر لکھا تو نہیں لیکن سترھویں صدی ہی سے تصوف پر اظہارِ خیال کرنے کا سلسلہ یقیناً شروع ہو چکا تھا، فارسی اور عربی رسائل صوفیانہ تجربے لیے آئے۔ اسی صدی سے اسلام پر بھی لکھنے کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ چینی مسلمان جو تصوف کو عزیز رکھ رہے تھے ایران کے صوفیانہ تجربوں سے زیادہ متاثر تھے۔ چینی مسلمانوں نے یونانی، بدھ، مسیحی اور

ہندستانی 'مسٹی سیزم' (Mysticism) کو ٹٹولا لیکن اُن کی جانب راغب نہ ہوئے، اسلامی تصوف اور اس کی روایتوں کو پسند کیا۔

جاپان کے معروف تاریخ داں تزاکا کوڈو (Tazaka Kodo) نے چینی مسلمانوں کے ایسے کئی کارناموں کا ذکر کیا ہے جن سے تصوف کی جانب ان کی رغبت اور صوفیانہ خیالات میں ان کی کشش کا پتا چلتا ہے۔ جاپانی تاریخ دانوں کے ساتھ چند یوروپی تاریخ داں اور محققین بھی شامل ہوگئے اور انھوں نے تلاش و جستجو کی، یہ بتایا کہ چینی مسلمانوں کے پیشِ نظر فارسی اور عربی کتابیں رہی ہیں اور ان کتابوں اور رسالوں کے بڑے گہرے اثرات ہوئے ہیں۔ سب سے بڑا کام جاپان ہی کے Saguchi Toru نے کیا ہے۔ 1944 میں منگولیا کی بہت سی مسجدوں میں جاکر چینی علما سے گفتگو کی اور چینی تصوف کے تعلق سے چینی دستاویزات اور تحریروں کی ایک فہرست مرتب کی۔ اس میں 21 عنوانات عربی کے ہیں اور سترہ فارسی کے۔

چینی علما نے نقشبندی سلسلے کے تعلق سے عقائد کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ حضرت شیخ نجم الدین رازیؒ کے خیالات مختلف ارشادات کی صورت میں کئی جگہ ملے۔ اسی طرح فخر الدین عراقیؒ کے اقوال بھی موجود تھے۔ چینی مسجدوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ان میں کتب خانے صدیوں سے موجود رہے ہیں، مذہبی کتابوں سے پُر کتب خانے، حضرت سعدی شیرازیؒ کی 'گلستاں' کے نسخے بھی موجود تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ابن عربی اور بعض بزرگوں کے اقوال بھی تھے۔

چینی مسلمانوں نے 'نصاباتِ صوفیا' کو بڑی اہمیت دی اور ان سے تصوف کی روشنی حاصل کرتے رہے، کہا جاتا ہے کہ جس پہلے چینی عالم نے اسلام کے موضوع پر کتابیں تصنیف کیں وہ Wang Taiyu ہیں، انھوں نے مابعد الطبیعات اور تاریخ اور تاریخ اسلام سے گہری دلچسپی لی۔ بڑے اچھے مقرر تھے، مسجدوں میں تصوف پر تقریریں کرتے جن سے چینی ذہن متاثر ہوتا، ان کی معروف کتاب "سچی تعلیم پر سچا تبصرہ" ہے۔ جو 1642 میں شائع ہوئی اور اس کے مسلسل کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ 'تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ کائنات کا مقصد' فطرت اور اللہ کا وجود' انسان دوستی اور انسانِ کامل، روح کی پاکیزگی وغیرہ ان کے محبوب موضوعات رہے ہیں، انھوں نے روحانیات کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالتے ہوئے شریعت کو پیشِ نظر رکھا۔ جب بھی تقریر کرتے یا کچھ تحریر کرتے تو ایک ہی بنیادی سوال اٹھاتے "ہم اسلام کیوں قبول کریں؟' پھر اپنی جانب سے دلائل کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے۔

ان کے علاوہ ایک اور معلمِ اسلام اور صوفیانہ فکر و نظر کے مالک Liu Chih تھے۔ کہا جاتا ہے 1670 میں اُن کی پیدائش ہوئی تھی انھوں نے تصوف پر سیکڑوں رسالے چینی زبان میں لکھے ہیں۔ بڑے عالم تھے، بدھ ازم اور تاؤازم کے ساتھ اسلامی ادبیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، مغرب کے محققین چین پر کام کرتے ہوئے انھیں اور ان کے عالمانہ مقالوں اور رسالوں کو آج بھی موضوع بنا رہے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ حضرت عبدالرحمان جامیؒ (وفات 1492) کی معروف تصنیف 'لوائح' (Lawaih) (روشنیاں) ہے حضرت جامیؒ مشرقی خطے کے ایک انتہائی ممتاز اور جید 'مفکرِ اسلام تھے" حضرت جامیؒ نے عربی اور سعادت الدین فرغانیؒ کی تعلیمات کو جس طرح پیش کیا ہے ہم سب بخوبی جانتے ہیں صدیوں اس کے دوررس اثرات ہوئے ہیں۔ ان کی اور بھی تصنیفات کا ذکر ملتا ہے جن میں تصوف کے رموز و اسرار کا ذکر ہے۔ ان میں وہ نقشبندی صوفیائے کرام کے خیالات سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ 'لوائح' میں حضرت جامیؒ نے تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے فلسفیانہ نکات خوب اُبھارے ہیں، فلسفے کو بڑی اہمیت دی ہے، ان کے کلام میں فارسی شاعری کا جلال و جمال متاثر کرتا ہے۔ Liuchih نے ترجمہ کرتے ہوئے نثر کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ انھوں نے کنفیوشس کی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے اور عربی اور فارسی اصطلاحوں سے بھی 36 ابواب میں تصوف کے تعلق سے ان کی اپنی فکر و نظر کم اہمیت نہیں رکھتی۔ وحدت الوجود پر حضرت جامیؒ کے خیالات کو عوام تک لے جانے میں ان کا نمایاں رول رہا ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ بھی پیشِ نظر رہا ہے کہ صوفیوں کے نزدیک ہر چیز، ہر شے اللہ کی جانب لوٹ جانے والی ہے، یہ توانائی یا 'انرجی' کا اصول ہے جسے "Li-chi" کہتے ہیں۔

(زیرِ ترتیب کتاب "تصوف کی جمالیات" سے)

□□□

"Madhuban" A-267, South City,
Gurgaon-122001 (Haryana)

آسان اور عام فہم زبان میں طلبہ کے لیے

ڈپلوما کمپیوٹر اپلی کیشن اور ملٹی لنگول ڈی ٹی پی

قیمت: -/32 روپے

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

سید اطہر رضا بلگرامی

پبلک سیکٹر — معاشی اصلاحات کے دور میں

ہندستان کی منصوبہ بند معاشی ترقی کے آغاز سے ہی پبلک سیکٹر کو ملک کی ترقی کے سرپرست کے طور پر پیش کیا گیا اور "کمانڈنگ ہائیٹس" کی ذمے داریاں سونپی گئیں۔ ہندستان کی پچاس سالہ معاشی ترقی کا تجزیہ منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ قومی سطح پر بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرنے اور بنیادی سہولتوں و خدمات کو مہیا کرنے اور اُن کو فروغ دینے میں پبلک سیکٹر نے مرکزی رول ادا کیا ہے۔ اُس کا نصب العین منافع سے زیادہ سوشل مارجینل پروڈکٹی ویٹی (Social Marginal Productivity) کی توسیع و ترقی رہا اور وہ اپنے اس مقصد کے حصول میں کامیاب رہا۔

معاشی اصلاحات کے دور نے پبلک سیکٹر کی سرپرستانہ فوقیت کو کم کرنا شروع کیا۔ پبلک سیکٹر کے انوسٹمنٹ میں تخفیف کا سلسلہ 1991 کی نئی معاشی پالیسی سے شروع ہو گیا اور اس کے اب تک کئی دور ہو چکے ہیں۔ پبلک سیکٹر کے حصص کو فروخت کیا جانے لگا اور اس طرح نجی سیکٹر کو ملکیت میں شریک ہونے کی دعوت دی جانے لگی۔ کمزور اور غیر منافع بخش صنعتی اکائیوں کو جن کو بیمار انٹر پرائزز کہا جاتا ہے، بند کیا جانے لگا۔ 17 اکائیاں جو پبلک سیکٹر کے ہی لیے مخصوص تھیں اُن کی تعداد گھٹ کر اب صرف چھے رہ گئی ہے۔ اس طرح گویا گیارہ ایسی اکائیاں اب نجی سیکٹر کے لیے کھول دی گئی ہیں۔ پبلک سیکٹر کی کارگزاریوں کا جائزہ لیتے وقت بنیادی اعتراض یہ کیا گیا کہ اس سیکٹر میں جس قدر بڑا سرمایہ لگایا گیا ہے اور لگایا جارہا ہے اُس کے تناسب میں منافع و اہلیت کے بڑھنے کی شرح بہت کم ہے جبکہ نجی سیکٹر میں اپنے لگے سرمایے کے تناسب میں کہیں زیادہ۔ اس لیے نقصان سہتے رہنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ انوسٹمنٹ کو کم کیا جائے، نجی سیکٹر کو شمولیت کی دعوت دی جائے، پبلک سیکٹر کی اجارہ دارانہ مرکزی نگہداشت میں تخفیف کی جائے، کمزور اکائیوں کو بند کیا جائے اور کام گاروں کے مفاد کا پورا تحفظ کیا جائے۔ اس طرح معاشی اصلاحات کے دور نے پبلک سیکٹر کی سرپرستانہ فوقیت کو منافع و اہلیت کی کسوٹی پر پرکھ کر کمزور اور نااہل ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اس وقت ہندستان میں ایک ہزار سے زیادہ پبلک سیکٹر یونٹس کام کر رہی ہیں جن میں آٹھ سو ریاستی ملکیت کی ہیں۔ ان پبلک سیکٹر یونٹس میں کچھ شعبہ جاتی Departmental نوعیت کی ہیں جیسے ریلوے، ڈاک و تار اور ٹیلی کمیونیکیشن؛ کچھ مالی ادارے ہیں جیسے اسٹیٹ بینک آف انڈیا، یونٹ ٹرسٹ، انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف انڈیا؛ کچھ گورنمنٹ کمپنیز اور کارپوریشن ہیں جیسے اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا، پیٹرو کیمیکل کارپوریشن لمیٹڈ؛ اور کچھ پارلیمانی ایکٹ کے ذریعے وجود میں آئیں جیسے کول انڈیا، انڈین ایئر لائنز اور نیشنل تھرمل پاور کارپوریشن۔ 55-1951 کے دوران صرف 5 پبلک سیکٹر انٹر پرائزز تھیں جن پر 29 کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ یہ تعداد 81-1980 تک 163 اور 97-1996 تک 236 ہو گئی جن پر لگا سرمایہ 18,207 کروڑ روپیہ سے بڑھ کر 2,02,022 کروڑ روپیہ ہو گیا۔ مرکزی پبلک سیکٹر انٹر پرائزز کی مجموعی بکری (Gross-Sales) بھی 81-1980 میں 28,635 کروڑ روپیہ سے بڑھ کر 97-1996 میں 2,31,578 کروڑ روپیہ ہو گئی۔ ان انٹر پرائزز میں 6755 فی صد اشیا پیدا کرنے اور فروخت کرنے والی نوعیت کی ہیں اور 3.4 فی صد خدماتی نوعیت کی۔ پیداوار کے میدان میں ایندھن، توانائی، کھاد، مشین و کل پرزے، بنیادی دھات اور Non-Ferrus Metal خصوصی اہمیت کی ہیں اور خدماتی میدان میں مالیات سب سے اہم ہیں۔ کول، لیگنائٹ اور پیٹرولیم کی کل پیداوار کا 95 فی صد اسی پبلک سیکٹر سے پورا ہوتا ہے۔

پبلک سیکٹر کا مزاج کاروباری نہیں ہے جہاں نفع و نقصان کو کامیابی و ناکامیابی کی کسوٹی بنایا جائے۔ نجی سیکٹر جس کی بنیاد شرح منافع پر ٹکی ہے، اپنے انوسٹمنٹ پلان میں بہت محتاط رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ مضبوط، مستحکم اور یقینی میدان منتخب کرتا ہے جہاں نقصان کے امکانات کم سے کم ہوں۔ اسی لیے جہاں وہ انوسٹمنٹ کرتا ہے وہاں استعداد و صلاحیتوں میں مسلسل توسیع کرتے رہنے پر نگاہ رکھتا ہے تاکہ شرح منافع کا حصول حوصلہ افزا بنا رہے۔ لیکن پبلک سیکٹر کی نگاہ شرح منافع کی مسلسل توسیع کے بجائے طویل مدتی امکانی سوشل منفعیت کے پھیلاؤ پر ٹکی ہے۔ اُس کے تحت اکائیوں کے انتخاب کی بنیاد Maximum Social Benefit ہے۔ بالعموم ایسی اکائیوں کی تکمیلی مدت طویل ہوتی ہے اور ابتدائی دور میں منافع نہ صرف انتہائی کم ہو سکتا ہے بلکہ خسارہ بھی سہنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن طویل مدت بعد یہی اکائیاں معیشت کی ٹھوس بنیاد بن کر دیگر تمام صنعتوں کی ترقی و توسیع کا موثر ذریعہ ضرور بن جاتی ہیں۔ ملک گیر توانائی کو پیدا کرنے اور تقسیم کرنے کا نظام، قومی شاہراہیں، دیو ہیکل ڈیم، لوہے و اسپات کی بھٹیاں، مشینیں تیار کرنے کے

کارخانے، ریلوے، ڈاک و تار، بنیادی دھات کو نکالنے اور اُن سے مختلف النوع اشیا تیار کرنے کے کارخانے اس کی مثالیں ہیں۔ اس لیے پبلک سیکٹر کی کارگزاریوں کو اگر پرکھنا ہے تو محض منافع کی سطح کو کسوٹی نہ بنایئے بلکہ یہ دیکھیے کہ اس سیکٹر نے معیشت کی بنیادوں کو کس طرح مضبوط و مستحکم کیا ہے۔ معیشت کے ڈھانچے کو کن کن سازوسامان کو دستیاب کرانے و صلاحیتوں کو اُبھارنے کا ذریعہ بنایا ہے اور کس کس طرح مختلف النوع سہولتوں سے معیشت کو لیس کیا ہے۔

اگر کسی پبلک سیکٹر یونٹ میں لوہا واسپات، مان لیجیے، پانچ ہزار کروڑ روپے کا پیدا کیا جارہا ہے اور اُس کو دانستہ طور پر کم قیمت پر کچھ اہم و بنیادی صنعتوں کو دستیاب کرایا جارہا ہے تاکہ اُن کا فروغ مستقبل میں متعدد دوسری صنعتوں کی ترقی کا باعث بنے تو پھر یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ پبلک سیکٹر میں لوہے اور اسپات کی پیداوار گھاٹے کا سودا ہے۔ ہم کو اس مقام پر منفعت کے اس رُخ کو نظرانداز نہیں کرنا ہے کہ یہ پانچ ہزار کروڑ روپے مالیت کا لوہا و اسپات قومی پیداوار میں شامل ہوکر سیکڑوں صنعتوں کی ترقی کا باعث بن رہا ہے اور اُن کی پیداوار کا فروغ مزید قومی پیداوار کو بڑھانے کا ذریعہ۔ یہاں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ آج نجی سیکٹر جس منافع اور صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے مقابل پبلک سیکٹر کی نکتہ چینی کررہا ہے دراصل اُس کا فروغ و ترقی اسی پبلک سیکٹر کی قائم کی ہوئی مضبوط بنیادوں کی مرہونِ منت ہے۔ مزید، نجی سیکٹر کا منافع و صلاحیتیں اُس کی انٹرپرائزز کے دائرے میں ہی محدود رہتی ہیں کیوں کہ وہ بیشتر ایسی اشیاء صرف مہیا کرتی ہیں جن کا سیدھا تعلق صارفین سے ہے اور جو قلیل مدت میں بہتر منافع دے سکتی ہیں۔ وہ اگر پھیلتا اور وسیع بھی ہوتا ہے تو محتاط ہوکر ـــــ منافع کی ضمانت کا لحاظ رکھ کر جہاں جہاں کارکردگی میں جھول پایا گیا، صلاحیتوں کو فرسودہ ہوتے دیکھا، اُس کو اپنی ساکھ میں دراڑ پڑتی نظر آئی اور منافع کرنے کا خطرہ لاحق ہوگیا، اسی مقام سے اُس نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔ پھر کتنے بے روزگار ہوئے، کتنا سرمایہ ڈوبا، کتنا دوسری محفوظ جگہ منتقل کرنا پڑا اور اُس کی کیا لاگت آئی یہ تمام فیصلے اپنی قائم کردہ بازار کی ساکھ کو بحال رکھنے کی خاطر جائز سمجھے جانے لگے۔

پبلک سیکٹر کا مطمحِ نگاہ کہیں زیادہ وسیع ہے جہاں نفع بطور زر نہیں ہے بلکہ بطور "مواقع" (Opportunity) ہے۔ اُس کا نفع و صلاحیتیں بازار کی کاروباری سرحدوں سے نکل کر وسیع قومی مفاد کے دائرے میں ضم ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر پبلک سیکٹر کے نقصانات و کم منافع کا تجزیہ کیا جائے تو پھر ہم کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ آیا یہ نقصان اس کی گرتی ہوئی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے یا کمزور، بیمار صنعتوں، اداروں کو سہارا دینے، سنبھالنے اور اُن کے ضامن بن جانے کی لاگت برداشت کرتے رہنے کا۔ اس فلاحی پہلو میں نجی سیکٹر کے زاویۂ نگاہ سے تو واضح نقصان ہے لیکن اگر پبلک سیکٹر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو قومی اثاثے کے تحفظ کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اگر Rate of Return کو محدود دائرے میں رکھ کر کامیابی و ناکامیابی کا پیمانہ تسلیم کرلیا جائے تو بھی پبلک سیکٹر کی کارگزاری مایوس کن نظر نہیں آتی۔ پبلک سیکٹر کا مجموعی منافع جو 81-1980 میں 1.418 کروڑ روپیہ تھا وہ 98-1997 میں بڑھ کر 29,399 کروڑ روپیہ ہوگیا۔ خالص منافع Net-Profit جو 81-1980 میں منفی تھا وہ 98-1997 میں مثبت بن کر 10,258 کروڑ ہوا۔ مجموعی لگے سرمایے میں منافع کا تناسب جو 81-1980 میں 7.8 فی صد تھا وہ 97-1996 میں بڑھ کر 14.5 فی صد ہوگیا اور اسی مدت میں کل پیداوار Turn-over میں منافع کا تناسب 5 فی صد سے بڑھ کر 12.3 فی صد ہوگیا۔ لگے سرمایہ میں خالص منافع جو 81-1980 میں منفی 101 فی صد تھا وہ 91-1990 میں مثبت بن کر 2 فی صد اور 97-1996 تک 5.1 فی صد ہوا۔

ہاں، کارگزاریوں کے تجزیے کا وہ رُخ یقیناً تشویش کا باعث ہے جہاں پبلک سیکٹر کی اکائیوں میں، بہ اعتبار کارگزاریوں کے معیار کے، نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ کچھ اکائیاں انتہائی اعلیٰ معیار کی صلاحیتوں کا ریکارڈ رکھتی ہیں تو کچھ متواتر پست ہوتی چلی جارہی ہیں۔ وہ پبلک انٹرپرائزز جو قابلِ فروخت اشیا تیار کرتی ہیں اُن میں 96-1995 تک 80 اکائیاں ایسی تھیں جو خالص نقصان پر تھیں اور 83 ایسی تھیں جو خالص منافع دے رہی تھیں۔ 97-1996 میں نقصان پر چلنے والی اکائیوں کی تعداد بڑھ کر 81 ہوگئی اور منافع دینے والی اکائیوں کی تعداد گھٹ کر 80 رہ گئی۔ اسی طرح جو خدماتی انٹرپرائزز تھیں اُن میں 96-1995 تک 22 ایسی تھیں جو خالص نقصان پر چل رہی تھیں۔ یہ تعداد 97-1996 میں بڑھ کر 23 ہوگئی۔

جہاں تک پیدا کردہ صلاحیتوں کے بھرپور استعمال (Optimal Use) کا سوال ہے تو یہاں بھی اعداد و شمار مایوس کن معلومات فراہم کرتے ہیں۔ تخمینہ لگایا گیا کہ ان انٹرپرائزز کی بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کا صرف 50 فی صد ہی استعمال کرپاتی ہیں۔ 84-1983 میں پیدا کردہ صلاحیتوں کا صرف 51.2 فی صد ہی استعمال ہوا۔ 85-1984 میں یہ فی صد صرف 48 فی صد رہ گیا، 92-1991 میں 46 فی صد۔ 92-1991 تک 46 فی صد انٹرپرائزز ایسی تھیں جن کی پیدا کردہ صلاحیتوں کے استعمال کا فی صد 75 فی صد سے کم تھا اور 20 فی صد ایسی تھیں جن کی صلاحیتوں کے استعمال کا فی صد 50 فی صد سے بھی کم تھا۔

کیا وجہ ہے کہ قومی معیشت کا ایسا بنیادی اور اہم سیکٹر اپنی اہلیت و کارکردگی کے استعمال کے نقطہ نظر سے اتنا کمزور ثابت ہوا۔ مصلحتاً منافع خواہ کم کمایا جائے یا نہ کمایا جائے لیکن اپنی پیدا کردہ صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں اتنا پیچھے کیوں رہا اور کیوں نقصان پر چلنے والی اکائیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کو نجی سیکٹر کی کارکردگی کے مقابلہ لاکر تولا گیا اور طے کیا گیا کہ Disinvestment کے توسط سے نجی سیکٹر کو بہتر کارکردگی کا موقع دیا جائے۔ اس کے دو مقصد واضح ہیں۔ اول Disinvestment کے ذریعہ پبلک سیکٹر نجی سیکٹر کو اپنی ملکیت کا حصہ دار بنائے گا اس یقین کے ساتھ کہ مجموعی کارکردگی میں سدھار آئے گا۔ پبلک سیکٹر کی انوسمنٹ اجارہ داری نے مقابلے کی فضا کو مفقود کر دیا، بیوروکریسی یعنی نوکر شاہی کو بڑھاوا ملا اور فعال کام کے کلچر Usefull Work Culture کو پیدا ہونے سے روکا۔ نجی سیکٹر کی شمولیت بہ حیثیت ملکیت کے مقابلے کی فضا سازگار کرے گی، بیوروکریسی کو کم کرے گی اور بیجا ضابطوں اور اصولوں کو ختم کر کے کھلی فضا کو پیدا کرے گی۔ اس طرح صلاحیتوں کے بہتر استعمال کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ Disinvestment کے ذریعے شیئرز مارکیٹ میں فروخت کر کے جو رقم جمع ہوگی وہ ہمارے خسارے کے بجٹ کو کم کرنے کا ایک غیر افراط زر نوعیت کا ذریعہ بنے گی۔

لیکن پبلک سیکٹر کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا حل "نجی کرن" نہیں ہے کیوں کہ اُس کی بھی اپنی کوتاہیاں ہیں۔ نجی سیکٹر جو مارکیٹ پر تکیہ کیے بیٹھا ہے وہ اتنی اہل نہیں ہے کہ قومی سطح کے پیچیدہ معاشی مسائل کا پراثر و کارآمد حل تلاش کر سکے۔ معاشی ترقی کی تاریخ شاہد ہے کہ بازار کی قوتیں ناکامیاب ہوئی ہیں۔ یہاں بھی فلاح کا تصور ہے لیکن مقصد فلاح برائے افادیت ہے۔ یعنی اگر نجی سیکٹر کو کوئی افادہ نہیں تو فلاح کا تصور بے معنی۔ یہاں بھی اجارہ داری اور استحصال کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جہاں بازاروں کی قوتیں کمزور ہیں، کمی ہوئی اور محدود ہیں وہاں محض Disinvestment کے ذریعے ملکیت کی منتقلی قومی سطح کے معاشی مسائل جیسے غربت و بے روزگاری، سماجی و اقتصادی مساوات، موقعوں کی مساوی فراہمی، فی کس آمدنی میں اضافہ وغیرہ کا حل پیش کرنے سے قاصر ہے۔ Disinvestment سے یہ اُمید کرنا کہ انٹرپرائزز منافع بخش بن جائیں گی، صلاحیتوں اور کارکردگی میں اضافہ ہوگا، غلط تصور ہے۔ یہ سب کچھ اس پر منحصر ہے کہ بازار کی طاقتیں، اُن کی اثر انگیزی اور دائرۂ اثر کس معیار کے ہیں اور کتنے وسیع ہیں۔

جہاں تک Disinvestment کے ذریعے غیر افراط زر نوعیت کی رقوم جمع کر کے خسارے کو کم کرنے کا مقصد ہے تو یہاں بھی ہم کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اول شیئرز کے نرخ بازار کے نرخ سے بہت نیچے رکھے گئے اور نتیجتاً شیئرز کی استعداد سے کہیں کم رقوم جمع ہو پائیں۔ مثلاً کامپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل آف انڈیا (Comptroller and Auditor General of India) کی 1993 کی رپورٹ نمبر 14 کے مطابق HPCL کے شیئرز کی قیمت 243 روپے آنکی گئی جبکہ بازار میں اس کی قیمت 550 روپے ہوئی۔ اسی طرح NLC کے شیئرز کی قیمت 11 روپے رکھی گئی جبکہ بازار میں 82 روپیہ تھی۔ اس طرح رپورٹ کے مطابق شیئرز کی قیمت کو کم رکھنے کی بدولت اوسط نقصان 256 فی صد کا رہا۔ اگر ہم بازار کی قیمتوں پر شیئرز کو فروخت کرتے تو ہم کو مجموعی رقم 12.554 کروڑ روپیہ ملتی جبکہ صرف ہم کو 4951 کروڑ روپے ہی مل پائے۔ Disinvestment کے دوسرے دور میں بھی کم قیمت پر شیئرز کو فروخت کرنے کی روش قائم رہی۔ ساتویں دور میں (1994-95) انتہائی اعلیٰ کارکردگی کے پبلک سیکٹر یونٹس جیسے آئیل اینڈ نیچرل گیس کارپوریشن، اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا، انڈین آئیل کارپوریشن اور شپنگ کارپوریشن کے تھوڑے شیئرز (10 فی صد) پرائیویٹ سیکٹر کو پیش کیے گئے جس سے گورنمنٹ کو اپنے مقررہ نشانے 4000 کروڑ روپے سے بڑھ کر 4843 کروڑ روپے ملے۔ تخمینہ یہ لگایا گیا کہ ایسے اعلیٰ و مستحکم شیئرز تو بازار میں 8000 کروڑ روپے تک دے سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ Disinvestment کے عمل میں پبلک سیکٹر نے اپنے شیئرز کی قیمتوں کو اصل قیمت سے کہیں کم آنکا اور نقصان اُٹھایا۔

اگر Disinvestment کے نشانوں (Targets) اور حاصل شدہ رقوم کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ شیئرز کی بکری نشانوں کے مقابل کہیں کم ہوئی۔ 1993-94 میں 2,500 کروڑ روپے کا ٹارگیٹ تھا جبکہ حاصل شدہ رقم صرف 1913 کروڑ روپے تھی۔ 1995-96 میں ٹارگیٹ 7000 کروڑ روپے اور حاصل شدہ رقم صرف 168 کروڑ روپے تھی۔ 1996-97 میں 5000 کروڑ کا ٹارگیٹ تھا جبکہ جمع رقم صرف 500 کروڑ روپے تھی۔ 1997-98 میں ٹارگیٹ 4800 کروڑ کا رکھا گیا اور حاصل رقم صرف 907 کروڑ رہی اور پھر 1999-2000 میں ٹارگیٹ 10,000 کروڑ کا رکھا گیا جبکہ رقم کا حصول صرف 1829 کروڑ رہی۔

یہ رجحان اس بات کی علامت ہے کہ باوجود کم قیمت رکھنے کے نجی سیکٹر میں پبلک سیکٹر کے شیئرز خریدنے کے لیے دلچسپی و کشش کم ہے۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ نجی سیکٹر جس طرح کا ماحول چاہتا ہے، جیسی کھلی فضا چاہتا ہے اور

جس طرح کے قوانین اصولوں و ضابطوں کی پابندیاں چاہتا ہے وہ ابھی پبلک سیکٹر مہیا نہیں کر پا رہا ہے اس لیے اس میں جھجک پائی جارہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ Disinvestment کا فیصلہ کچھ عجلت اور دور رس منصوبہ بندی کو نظر انداز کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اگر حکومت اپنے شیئرز کو باقاعدہ جانچ پڑتال اور تنظیم نو کے ساتھ منافع بخش اکائیوں میں Re-invest کرنے کا پلان بناتی تو مستقبل میں نہ صرف اکائیوں میں توسیع ہوتی بلکہ خسارے کا انوسمنٹ بھی منافع میں بدل جاتا۔

Disinvestment کے عمل سے یہ تو ممکن ہے کہ نجی سیکٹر ملکیت میں شریک ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک معقول رقم بغیر افراط زر کے خطرے کے گھاٹے کے بجٹ کو کم کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم سوال تو یہ ہے کہ اس جمع رقم کو ہم کہاں انویسٹ کریں گے؟ کیا کوئی واضح پلان ہمارے پاس ہے؟ ہم کو رقم جمع کرنے سے زیادہ یہ سوچنا ہے کہ ہم اس کارگزاری سے کرنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا ہماری اس کاروائی سے روزگار میں توسیع ہوگی؟ اشیاء خدمات کی دستیابی بڑھے گی؟ کام کا ماحول زیادہ سازگار بن جائے گا؟ مواقع کی دستیابی میں مساوات بڑھے گی؟ عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا؟ بین الاقوامی بازاروں میں کیا ہم زیادہ پُر اعتماد بن جائیں گے اور کیا بہ حیثیت مجموعی سماجی فلاح کی سطح بلند ہو جائے گی؟ اگر ان سوالات کے جوابات اثبات ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ نجی سیکٹر کی حصہ داری اور شمولیت کو تیزی سے بڑھایا جائے اور اگر جوابات مشتبہ ہیں تو ہم کو غور کرنا ہوگا کہ نجی سیکٹر کی بڑھتی ہوئی شمولیت کس حد تک وسیع قومی اقتصادی مفاد میں ہے۔

□□□

Head, Department of Economics,
Jamia Millia Islamia, New Delhi-25

غیر اردو داں حضرات کو انگریزی کے ذریعے اردو سکھانے کی بہترین کتاب

Introductory Urdu

(دو جلدوں میں)

یونیورسٹی آف شکاگو میں پروفیسر چودھری محمد نعیم کی تصنیف اور
قومی اردو کونسل کی پیش کش

ہر چند کہ یہ کتاب بالخصوص ان لوگوں کے لیے بے حد مفید ہے جن کی مادری زبان انگریزی ہے مگر ہندستان میں بھی اردو سیکھنے کے خواہاں ایسے ذی علم لوگوں کی بڑی تعداد ہے جو انگریزی کی مدد سے اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب ان حضرات کے لیے بھی بہترین تحفہ ہے۔ مغرب کی دانش گاہوں کے بیشتر متعلمین نے اس کتاب کی مدد سے اردو سیکھی ہے۔ ان میں وہ تمام حضرات بھی شامل ہیں جو اب وہاں کی دانش گاہوں میں بہ طور اساتذہ برسر کار ہیں۔ کتاب کے مندرجات میں رسم الخط کے متعلقات، قواعد، قواعد کا اشاریہ، قواعد کی مشقیں، فرہنگ وغیرہ شامل ہیں۔

اردو سیکھنے کے خواہاں تمام حضرات سے اس کتاب سے استفادے کی پرزور سفارش کی جاسکتی ہے۔

دو جلدوں پر مشتمل 718 صفحات کی، خوبصورت طباعت سے آراستہ اس کتاب کی قیمت صرف 116 روپے ہے۔

ملنے کا پتہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔8، ونگ نمبر۔ 7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110 066

انسانی کلوننگ اور اخلاقی اقدار کا تصادم

اطالوی جنین داں ڈاکٹر سیوریو اینٹی نوری (Dr. Severino Antinori) نے، جو معجزاتی ڈاکٹر (Dr. Miracle) کے نام سے مشہور و معروف ہیں، 200 عورتوں کو کلون شدہ جنین کے مصنوعی طریقے سے حاملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اسقف اعظم جان پال دوم نے اس کی شدید مذمت کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کی بات میں زیادہ وزن ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سوال آسانی کے ساتھ حل کرنا ممکن نہیں کیونکہ جہاں بات کلوننگ کی آتی ہے تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس تجربے میں وہی تکنیک استعمال کی جائے گی جس تکنیک کے ذریعے ڈولی نام کی ایک بھیڑ کی تولید کی گئی تھی اور جس کو کلون ح۲ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اینٹی نوری ایک نشتر کے ذریعے مرد کے کندھے یا پیٹھ کی کھال کو کھرچ کر اس کا کچھ حصہ لیں گے۔ اس کو مختلف ادوار سے گزارنے کے بعد اس کے ایک خلیے (Cell) کو ایک ایسی پلیٹ میں رکھیں گے جس میں عورت کے بیضہ دان سے حاصل کیا ہوا ایک خاص بیضہ موجود ہو گا جس کا مرکزہ (Nucleus) پہلے ہی نکالا جا چکا ہو گا۔ اس تکنیک کے ذریعے، ایک خلیے (Cell) کے مرکزے کو نکال کر اسے عورت کے ایسے بیضے (Egg) میں جس کا مرکز (Nucleus) پہلے سے ہی نکال دیا گیا ہو، داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد بننے والے جنین کو عورت کے رحم میں داخل کرا دیا جائے گا جہاں یہ جنین مکمل پرورش پائے گا۔ گرچہ یہ طریقۂ کار بظاہر نہایت آسان ہے لیکن ماہرین نے کلوننگ کے اس عمل کو ہدف تنقید بنایا ہے اور اس کے منفی نتائج سے خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ڈولی کی پیدائش کے عمل میں جو تجربات کیے گئے تھے ان میں سے 250 سے زیادہ تجربات کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا کیونکہ ان سے ابنارمل جنین کی پیدائش ہوئی تھی۔ لہٰذا اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ کہیں یہی نتائج انسانی کلوننگ کے عمل میں بھی سامنے نہ آ جائیں۔

مندرجہ بالا تجرباتی عمل ان تمام بانجھ مرد اور عورتوں کے لیے امید کی کرن ہے جو والدین بننے کی امید کھو چکے ہیں۔ اٹلانٹک کے دونوں جانب کے سائنسداں اینٹی نوری کے اس تجرباتی کارنامے کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا یہ کام نہ صرف طبی نقطۂ نظر سے بلکہ اخلاقی طور پر بھی غیر منصفانہ ہے۔ اس احتجاج کے باوجود، ڈاکٹر اینٹی نوری اپنے فیصلے پر بضد ہیں اور اس کام کو انجام دینے کے لیے کسی ایسی جگہ مثلاً سمندر کی ایسی جگہ کی تلاش میں ہیں جہاں کسی ملک کی اجارہ داری نہ چلتی ہو اور اخلاقیات کی بنیاد پر احتجاج کی کم گنجائش ہو۔ ان کا یہ فیصلہ یقیناً ایک ایسی تجرباتی مہم کے امکان کو ہوا دیتا ہے جس کے تحت انسانی بقا کے نظام کو خطرہ لاحق ہے۔

یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے لہٰذا سائنس، سیاست اور مذہب کے درمیان جن کا زندگی سے گہرا رشتہ ہے، ایک دھماکہ خیز خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور اس صورت حال کو پیدا کرنے میں نہ صرف اس اطالوی سائنسداں کا ہاتھ ہے بلکہ ایک امریکی ممبر پارلیمنٹ کے مطابق پورے شیطان خصلت سائنسدانوں کی شمولیت ہے۔ ایک چھان بین کے بعد پتا چلا ہے کہ سائنسی فطاسی فرقے کے پاس کلوننگ تیار کرنے کی اپنی تجربہ گاہ موجود ہے۔ اس بات کی بھی تصدیق ہوئی ہے کہ امریکی ریاست مغربی ورجینیا کے ایک سابق سیاست داں نے اس کام کی حمایت میں کافی پیسہ صرف کیا ہے اور وہ اپنے مردہ نوزائیدہ بچے کی کلوننگ کی امید رکھتے ہیں۔

مارک بنٹ جو پیشے سے وکیل ہیں اور کانگریس کے سابق ممبر بھی تھے، ایک حیاتی کیمیا داں برگیٹ لوازلر اور دیگر ہم خیال لوگوں کو یقین ہے کہ اس زمین پر کسی دوسرے سیارے کے لوگوں نے آکر جینیٹک انجینیئرنگ کے ذریعے زندگی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اپنے اس عجیب و غریب عقیدے کے ساتھ لوازلر کی کمپنی کلون ایڈ نے کئی کارنامے انجام دیے ہیں۔

امریکہ کے ایک دوسرے ڈاکٹر کا انٹرنیٹ پر کلوننگ کے لیے والدین کو مدعو کرنے کا اشتہار اس بات کی دلیل ہے کہ اس کام کو روکنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اینٹی نوری نہایت ہی پرامید نظر آرہے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ وہ دوسو (200) عورتوں کی کلوننگ کریں گے اور اس کے نتائج کی تفتیش کریں گے۔ اس کے لیے وہ خواہش مند عورتوں کی بچے دانیوں میں جنین رکھیں گے اور گیارہ ہفتے کی مدت گزارنے کے بعد بچے دانی میں تیار شدہ کلون کا معائنہ کریں گے اور اس کے بعد حاملہ کا ہر ہفتے الٹرا ساؤنڈ اور دیگر تکنیکوں کے ذریعے چیک اپ کرتے رہیں گے۔

● ٹونی ایلن ملز، جان فولین کے مضمون اور ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی 10/ اگست 2001 کے اداریے سے ماخوذ۔

ان کا کہنا ہے کہ وہ جانوروں پر کی گئی کلوننگ میں ناکامی کی شرح سے واقف ہیں لیکن یہ ناکامی انسانوں کی کلوننگ کے تجرباتی عمل میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ انھوں نے 62 سالہ عورت کے پیٹ سے بچہ پیدا کرایا تھا جو یقیناً خطرناک تھا اور اس میں ماں اور بچے کی جان جا سکتی تھی۔

ڈاکٹر اینٹی نوری چوہوں پر تجربہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے پچھلے دنوں دس (10) چوہوں کی کلوننگ کی تھی۔ اس کلوننگ کے ذریعے پیدا ہونے والے بچوں میں کوئی نقص نہیں تھا لیکن ان دس چوہوں کو پیدا کرنے کے لیے سو جینین کی کلوننگ کی گئی تھی جس میں 15% اسقاطِ حمل کا شکار ہو گئے۔

اس ناکامی کو تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر اینٹی نوری نے کہا ہے کہ اس سے انسانی جینین کے کلوننگ کے عمل میں کامیابی کی شرح کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کامیابی کی یہ شرح دس فیصد (10%) بھی ہو سکتی ہے اور پچاس فیصد (50%) بھی، لیکن اس عمل کے بعد جو جینین کامیاب ہوں گے ان کا استعمال کیا جائے گا اور جو نہیں ہوں گے ان کو پھینک دیا جائے گا۔ اس غیر مستعمل جینین کو ختم کر دینے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اینٹی نوری کے جینین کے متعلق اس جارحانہ نقطہ نظر نے نہ صرف ان کے ناقدین کو پریشان کر دیا ہے بلکہ امریکی اور برطانوی سائنسدانوں کا جنین اور کلوننگ کے متعلق اہم تحقیقاتی کام بھی متاثر ہو رہا ہے۔ کلوننگ کے ذریعے بچہ پیدا کرنے کے عمل پر تحقیق جو بانجھ پن کا علاج ثابت ہو سکتی ہے، اس صورتِ حال میں اسے نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔

کلوننگ کے اس طریقۂ کار سے سائنسداں اس نتیجے کی امید رکھتے ہیں کہ تیار شدہ ٹشو کے ٹرنسپلانٹ، شوگر کے مرض میں انسولین (Insulin) کی فراہمی اور ریڑھ کی بیماری مثلاً پارکنسن (Parkinson) اور الزیمر (Alzheimer's) وغیرہ بیماری میں یہ تحقیق کام آ سکتی ہے۔ ڈولی نام کی بھیڑ کی کلوننگ کرنے والے برطانوی سائنسداں نے ڈاکٹر اینٹی نوری پر الزام عائد کرتے ہوئے ان کے اس تحقیقی منصوبے کو نقصان دہ قرار دیا ہے۔

گرچہ اس بڑے پروجیکٹ کے ذریعے سائنس کے بے جا استعمال کے خوف نے آگ پر تیل کا کام کیا ہے لیکن بیک وقت اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں کے لیے جو بچوں کی شدید خواہش رکھتے ہیں لیکن قدرتی طور پر نااہل ہونے کی وجہ سے اپنی اس خواہش کی تکمیل پر قادر نہیں ہیں، یہ تحقیق کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ سوال اس وقت بھی باقی رہے گا کہ آخر انسان کو اپنی امیدوں کی باریابی کی کیا قیمت چکانی ہوگی؟ کلوننگ کا یہ طریقہ بانجھ پن کے علاج میں کس حد تک کارآمد ثابت ہوگا؟

سائنسداں کساندرس (Cassandras) کے مطابق ڈاکٹر اینٹی نوری کو بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا کیوں کہ اگر اس سے ذرّہ برابر بھی چوک ہوئی تو نتیجے میں اس تجربے سے مردہ یا آدھے ادھورے بچوں کی پیدائش عمل میں آئے گی کیونکہ اس سے قبل جانوروں کے اوپر کیے گئے کلوننگ کے تجربات میں ناکامی کی شرح 90 فیصد سے زیادہ تھی۔ ایسے حالات میں عجب نہیں اینٹی نوری کو شیطان فرینکس ٹمین کا لقب دے دیا جائے جس نے ان حدود میں داخل ہونے کی کوشش کی جہاں فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اندیشوں کے برعکس اگر ڈاکٹر اینٹی نوری اپنے اس تجربے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کیا ہوگا؟ اس وقت کیا ہوگا جب ڈاکٹر مراکل کامیابی کا تمغہ حاصل کر لیں گے، صرف "کلوننگ" کے لطیف اور عمدہ طریقۂ کار اور جینین پر انتہائی باریک بینی سے مشاہدے کے سبب؟ کیا انھیں طب کے میدان میں نمایاں مقام حاصل ہوگا، اس بات کے لیے کہ انھوں نے مردوں کے بانجھ پن کا علاج ڈھونڈ کر ایک بڑا معرکہ سر کر لیا؟ کیا یہ طریقۂ کار عورتوں کے بانجھ پن میں بھی اتنا ہی مفید ثابت ہوگا؟ کیا یہ اخلاقی طور پر درست ہوگا کہ کسی انسان کو اپنی تخلیقِ نو (Recreation) کے حق سے محروم کیا جائے؟ اور یہ سوال بھی اہم ہے کہ کلوننگ کے ذریعے تیار شدہ لوگوں کے حقوق کیا ہوں گے؟ والدین کی شفقت و محبت کے بنیادی حقوق کیا انھیں حاصل ہوں گے؟ کیا کم یا زیادہ معذور ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا جائے گا؟

ڈاکٹر اینٹی نوری کا خیال ہے کہ کلوننگ کے ذریعے عام بچے پیدا کیے جائیں گے جو کسی فردِ مخصوص کی فوٹو کاپی نہ ہو کر ایک علاحدہ فرد کی حیثیت رکھیں گے۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ یہ بات صحیح ثابت ہوگی۔ جس بات سے اندیشے پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر اس سائنس کو شیطان صفت لوگوں نے ہائیجک کر لیا تو کیا ہوگا؟ جدید سے جدید تر ایجادات کے سودمند اور نقصان دہ استعمال کے امکانات موجود ہیں۔ ہم اس ذمے داری کو مل جل کر ادا کریں کہ ہم اشرف المخلوقات کہلانے کے حقدار رہیں۔

(ترجمہ: عبدالقیوم)

❖❖❖

بزدلی کا ڈر نہیں

کامیڈین، مصنف اور برٹش ریڈیو کی لی جینڈری کامیڈی سیریز The Goon Show کے ایک رکن اسپائک ملی گین (Spike Milligan) کا 27، فروری 2002 کو 83 برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ملی گین 1918 میں احمد نگر میں پیدا ہوا تھا۔ موت کے حوالے سے اس کا ایک جملہ بہت مشہور ہوا— "مرنے میں مجھے کوئی عار نہیں لیکن جب موت آئے تو وہاں مجھے موجود نہیں ہونا چاہیے۔" (I dont mind dying. I just dont want to be there when at happens.)

ان صفحات میں پیش ہے ملی گین کی 1963 کی تصنیف پکون (Puckoon) سے ایک اقتباس۔

ملی گین کی ٹانگیں اس کے لیے بے حد پریشانی کا سبب تھیں۔ اٹلی کی جنگ کے دوران، توپوں کی گڑگڑاہٹ اور آگ اگلتے گولوں کے زیر سایہ جہاں ایک طرف اس کا دماغ بہادری کے جذبات سے معمور تھا، وہیں اس کی ٹانگیں اس کے ان جذبات کو اپنی پوری رفتار سے مخالف سمت میں لے جا رہی تھیں۔ بیٹری میجر کی سمجھ میں یہ تضاد نہیں آیا:

میجر: بندوقچی ملی گین! آپ کو معلوم ہے آپ کا رویہ بزدلانہ ہے؟

ملی گین: نہیں جناب! یہ بات بالکل غلط ہے۔ میں ہیرو ہوں۔ بس میری ٹانگیں بزدلوں جیسی ہیں۔ مگر چھاتی تو بہادروں کی سی ہے۔

میجر: خاموش! تم اپنے مورچے سے کیوں بھاگ آئے؟

ملی گین: میں نے مورچہ کہاں چھوڑا جناب۔ دراصل خندق کی چھت میں دیمک لگی تھی اور وہ بس میرے سر پر گرا چاہتی تھی۔

میجر: خاموش! تم نے بزدلوں کی سی حرکت کی ہے۔

ملی گین: نہیں جناب، بالکل نہیں کی۔

میجر: کاش میں تمہیں گولی مار سکتا۔

ملی گین: گولی؟ بزدلی کی پاداش میں اگر مجھے گولی ہی ماری جانی تھی تو بہتر تھا کہ یہ کام امن کے زمانے میں کیا جاتا۔ میں اُس وقت بھی تو ایسا ہی بزدل تھا جیسا آج ہوں۔

میجر: جنگ کے زمانے میں تم جیسے لوگوں سے بات کرنا وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ سمجھے!

ملی گین: جی، بالکل صحیح۔ امن کے زمانے میں آپ جیسے لوگوں سے بات کرنا وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

"خاموش نالائق! افسر کے ساتھ تمیز سے بات کرنا سیکھو۔" سارجنٹ میجر اس کے کان میں چیخا۔

ملٹری اتھارٹی کے سامنے ملی گین کی پیشی ہوئی۔ اتھارٹی کے سامنے اس کی ساری دلیلیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ہتھیاروں سے لیس بڑے بڑے افسروں میں گھرے ملی گین کا کورٹ مارشل ہوا۔ یہ افسر ملی گین کی طرح بزدل نہیں تھے شاید اسی لیے ان کا رویہ ملی گین کے خلاف جانب دارانہ تھا۔

"میں بزدل ہو سکتا ہوں، جناب عالی مجھے اس سے انکار نہیں۔" ملی گین نے کورٹ کو سمجھایا "لیکن آپ اصولی طور پر مجھ پر بزدل ہونے کا الزام عائد نہیں کر سکتے۔ اگر آپ مجھے ذمے دار ٹھہراتے ہیں تو پھر آپ میری ناک کی ساخت، بالوں کی رنگت اور میرے پیروں کے سائز کے لیے بھی مجھے ذمے دار ضرور ٹھہرائیں۔"

"بندوقچی ملی گین" کیپٹن مارٹن نے پیدل سپاہی کے پیدل چہرے کے سامنے اپنی دلیرانہ مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا، "بندوقچی ملی گین! بزدلی کے بارے میں آپ کے مشاہدے سے عدالت کو غرض نہیں۔ آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لیے میں اس لفظ کی تعریف لفظ بہ لفظ پڑھ کر سناتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے King's Regulations کی کتاب اٹھائی، ایک نشان زدہ صفحہ کھولا اور ملی گین پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ "بزدلی: دشمن کا سامنا ہونے پر غداری کرنا۔ بھاگ جانا۔"

ملی گین: میں بھاگ نہیں رہا تھا جناب! میں تو پیچھے ہٹ رہا تھا۔

کیپٹن مارٹن: جب آپ کی پوری رجمنٹ پیش قدمی کر رہی تھی، ایسے وقت میں آپ نے پسپائی کا فیصلہ کیا؟!!

ملی گین: اوہ، میں اب سمجھا۔ ایک آدمی اگر پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کرتا ہے تو آپ اسے بھگوڑا کہتے ہیں اور جب پوری رجمنٹ بھاگتی ہے تو آپ اسے پیچھے ہٹنا کہتے ہیں؟ مجھے ایسے دوغلے معنی تسلیم نہیں۔ برائے مہربانی میرا مقدمہ بزدلوں کو سونپ دیا جائے۔

عدالت میں دبی دبی ہنسی ہر طرف گونجی۔ لیکن یہ ہنسی کا کھیل نہیں تھا۔

یہ احمق اس کو گولی مارنے کا حکم بھی صادر کر سکتے تھے۔

"کیا آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟" کیپٹن مارٹن نے پوچھا۔

ملی گین: جی ہاں، بہت کچھ۔ پہلی بات تو یہ کہ میں اس جنگ میں شامل ہونا ہی نہیں چاہتا تھا، مجھے زبردستی گھسیٹا گیا۔ میں نے میڈیکل آفیسر کو آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں بزدل ہوں۔ مگر اس نے مجھے جسمانی طور پر صحت مند ہونے کی سند دے دی۔ میں نے ہر ایک کو بالکل صاف صاف بتا دیا تھا جناب۔ میدانِ جنگ میں ایکشن سے پہلے میں نے اپنے بیٹری میجر کو بھی بتا دیا تھا جناب عالی۔ یہاں تک کہ میں نے فیلڈ مارشل مونٹ گومری کو بھی خط لکھ دیا تھا۔ جی ہاں، حضورِ عالی میں نے ہر ایک شخص کو آگاہ کر دیا تھا اور اب آپ حیرت کا اظہار کر رہے ہیں؟"

ملی گین نے ابھی اپنی بات بھی پوری نہیں کی تھی، ابھی وہ اپنی دلیلیں پیش ہی کر رہا تھا، کہ ججوں نے اپنے ذہنوں میں اسے مجرم قرار دے دیا۔

"آپ کی بات پوری ہوگئی۔" مارٹن نے مجرم کو سزا دینے کے اپنے فیصلے سے مطمئن ہو کر سوال کیا۔ ملی گین نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ زیادہ کہنے کا کیا فائدہ۔ البرٹ آئنسٹائن اگر پچاس بندروں کے سامنے ایک ہزار سال تک کھڑے ہو کر انھیں اپنی ریلیٹی وٹی کی تھیوری سمجھاتا رہتا تو بھی بندر بالآخر بندر ہی رہتے۔ (ہندستان ٹائمز، نئی دہلی، یکم مارچ 2002)

(مترجم: ارجمند آرا)

□□□□
□□

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے ایل نیل کنٹھ

مترجم: آر کے بھٹناگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف اول تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576 ، قیمت: 114

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45

سخنورانِ گجرات

مرتب: سیّد ظہیر الدین مدنی

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824 ، قیمت: 157

قطب مشتری

مصنف: اسد اللہ وجہی

"قطب مشتری" اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138

مرزا غالب

چھٹی قسط

اٹھارہ سو ستاون کی کہانی مرزا غالب کی زبانی

سچائی کے ساتھ، کہ سچائی کو چھپانا آزاد مزاجوں کا شیوہ نہیں، میں نیم مسلمان، کہ رواج اور مذہب کی پابندیوں سے بھی آزاد ہوں اور اپنی رسوائی کے غم سے بھی رہا۔ سدا میری یہ عادت رہی، کہ رات کو ولایتی شراب کے سوا میں کچھ نہیں پیتا تھا اور اگر نہیں پاتا تھا تو مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جب انگریزی شراب بہت مہنگی ہے اور میں سخت قلاش، اگر خدا دوست اور خداشناس، فیاض اور دریا دل مہیش داس، کتنے کی دیسی شراب بھیج کر، جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور مہک میں اس سے بڑھ کر ہے، دل کی آگ پر پانی نہ ڈالتا تو میں زندہ نہ رہ سکتا اور جگر تشنگی کی شدت سے دم توڑ دیتا۔

مدت سے میرا دل اپنی مراد در در ڈھونڈ رہا تھا، اسے جستجو
تھی کہ بادۂ ناب کے ایک دو ساغر (کہیں سے) مل جائیں۔
دانش مند مہیش داس نے مجھے وہ آب (حیات) بخشا جسے
سکندر اپنے لیے ڈھونڈتا پھرا تھا۔

انصاف سے نہیں گزرا جا سکتا اور جو دیکھا ہے، بن کہے نہیں چھوڑا جا سکتا، اس نیک طینت نے، شہر میں مسلمانوں کی آبادکاری کے سلسلے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، چونکہ سرنوشت آسمانی اس کے ساتھ نہ تھی، کام بننا مشکل ہو گیا۔ ہندوؤں کی آزادی اور آبادی سب جانتے ہیں کہ مہربان حاکموں کی مہربانی کا نتیجہ ہے اگرچہ اس خیر پسند خیر گزیں کی خیر خواہی اور کارسازی کا اس انتظام میں دخل رہا ہے۔ قصہ مختصر ایک نیک بخت آدمی ہے، لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور نای و نوش کے ساتھ، اچھی زندگی گزارنے والا۔ اگرچہ میرے ساتھ پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت سے، اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھے احسان مند کرتا ہے اور داد مہربانی دیتا ہے۔ میرے دوسرے دوستوں اور شاگردوں میں، ہیرا سنگھ جو ایک نیک نہاد اور نیک نام نوجوان ہے، مجھ پر بہت مہربان ہے، آتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نیم ویران نیم آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شیو جی رام برہمن جو ایک جوان دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے، اس درویش دلریش کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے اور اپنی بساط کے بقدر میری فرماں برداری کرتا اور میرے کام بناتا ہے۔ اس کا بیٹا بال مکند (بھی) جو ایک نیک طینت پرہیزگار نوجوان ہے، اپنے باپ کی طرح میری فرمانبرداری میں مستعد اور غمگساری میں یکتا ہے۔ دور دست دوستوں میں، آسمانِ مہر و مروّت کا وہ ماہِ کامل شیوا زبان ہرگوپال تفتہ، جو میرا ایسا ہمدم و ہم آواز ہے اور چونکہ شاعری میں مجھے اپنا استاد کہتا ہے، اس کا کلام، جملہ خداداد اوصاف کے ساتھ، میرے لیے سرمایۂ ناز ہے۔ قصہ کوتاہ، ایک مردِ آزادہ رو ہے، مجسم محبت اور سراپا مہربانی۔ شاعری اس کے فروغ کا باعث اور اس سے شاعری کا ہنگامہ گرم۔ فرطِ محبت سے میں نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے اور "مرزا تفتہ" خطاب دیا ہے۔ اس نے میرٹھ سے ایک ہنڈی مجھے بھیجی ہے اور غزل اور خط ہمیشہ بھیجتا رہتا ہے۔ یہ باتیں، جن کا بیان لازمی نہیں تھا میں نے خاص طور پر اس لیے بیان کیں کہ شکرِ محبت و انسانیت ادا ہو جائے اور جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھ میں پہنچے وہ جان لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں اور دن کو دیواروں کے روزن دھوئیں سے تہی۔ غالب شہر آشنا، ہزار دوست، جو ہر گھر میں کوئی دوست اور ہر مکان میں کوئی شناسا رکھتا تھا، اب اس تنہائی میں قلم کے سوا اس کا کوئی ہمنوا اور سائے کے سوا کوئی ساتھی نہیں۔

اب میں وہ ہوں کہ میرے چہرے پر رنگ نہیں آتا جب تک
میں خون کے آنسوؤں سے ہزار بار چہرے کو تر نہ کروں۔
میرے جسم میں جان و دل کی جگہ درد و دریغ نے لے لی ہے
اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں کا ہے۔

اگر شہر میں یہ چاروں آدمی بھی نہ ہوتے تو پھر میری بیکسی کا گواہ بھی کوئی نہ ہوتا۔ زمانے کی نیرنگ سازی پر مرتا ہوں کہ اس لوٹ مار میں، جب

● "دستنبو" جس کا اردو ترجمہ درج بالا عنوان سے یہاں قسط وار شائع کیا جا رہا ہے، غالب کی وہ مشہور فارسی تصنیف ہے جو انہوں نے مئی 1857ء سے جولائی 1858ء تک دہلی میں رہ کر سپردِ قلم کی۔ اس مدت میں دہلی میں جو فوجی اور سیاسی واقعے رونما ہوئے غالب نے ان کی تفصیلات تاریخ وار رقم کی ہیں۔ غالب ان تمام واقعات کے چشم دید گواہ تو نہیں کہے جا سکتے کہ ان دنوں وہ خانہ قید تھے لیکن کچھ واقعات انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے اور جو شنیدہ باتیں رقم کی ہیں، ان میں سے بیشتر کی تصدیق بھی دیگر ذرائع سے ہو چکی ہے۔ "دستنبو" کی ایک اہم خصوصیت غالب کا مخصوص طرزِ نگارش ہے جسے ترجمے میں قائم رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ مخمور سعیدی نے کیا ہے۔

شہر کے کسی گھر میں مٹی تک نہیں بچی، اس کے باوجود کہ میرا گھر لٹیروں کی درازدستی سے محفوظ رہا، میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے سوا، کچھ گھر میں نہیں رہا۔ اس معمے کا حل اور اس جھوٹ نظر آنے والے سچ کی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جب کالوں نے شہر پر قبضہ کرلیا، بیگم نے، مجھ سے کہے بغیر، قیمتی چیزیں، زیور وغیرہ، جو کچھ تھا، خفیہ طریقے سے پیرزادہ کالے صاحب کے گھر بھیج دیا، وہاں تہہ خانے میں محفوظ کرکے، دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔ جب لشکر آراؤں نے شہر کو فتح کیا اور لشکریوں کو لوٹ مار کا حکم ملا، بیگم نے اس راز سے مجھے باخبر کیا۔ کام ہاتھ سے نکل چکا تھا اور جاکر (سامان) لے آنا ممکن نہیں تھا۔ میں چپ ہو رہا اور خود کو (یہ کہہ کر) بہلالیا کہ یہ جانے والا ہی تھا، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گیا۔ اب، کہ جولائی کا یہ مہینہ پندرھواں مہینہ ہے، انگریزی حکومت سے جو قدیم پنشن ملتی تھی، اس کے دوبارہ ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، وہی بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر جسم وجان کی پرورش کرتا ہوں۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں، اور میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب سارے کپڑے کھا چکوں گا تو ننگا بھوکا مروں گا۔ ان نوکروں میں سے جو مدت سے میرے ساتھ ہیں، دو تین اس قیامت میں (بھی) مجھے چھوڑ کر نہیں گئے ہیں، ان کی بھی پرورش کرنی ہے اور سچ یہ ہے کہ آدمی کو آدمی سے مفر نہیں، اور کوئی کام کارگزار کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ان کو چھوڑ کر دوسرے مانگنے والے، جو پہلے سے خوشہ چینی اور بہرہ ربائی کے خوگر ہیں، اس برے وقت میں بھی مرغ کے خروش بے وقت سے زیادہ ناگوار اپنی جانگزا صدا سے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اب کہ جسمانی اور روحانی عوارض ومصائب کے دباؤ اور شدت نے جسم وجاں کا پلیتھن نکال دیا ہے، اچانک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کے سنوارنے میں جس کا نام کتاب ہے کب تک مشغول رہا جاسکتا ہے، یقیناً اس کشاکش کا انجام یا موت ہے یا دریوزہ گری۔ پہلی صورت میں یہ ناگزیر ہے کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے تکمیل سے عاری اور انجام سے محروم رہ جائے اور ناظرین کو افسردہ دل کرے۔ دوسری صورت میں، ظاہر ہے کہ انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے دھتکار کر، سر بازار ذلیل کیا گیا اور فلاں در سے صدا لگانے پر رتی دو رتی کچھ مل گیا اور یہ سب کچھ کب تک بیان کیا جاسکتا ہے اور آپ اپنی رسوائی کی جاسکتی ہے۔ پرانی پنشن اگر مل گئی، تب بھی (دل کے) آئینے سے زنگ صاف نہیں کرسکے گی اور اگر نہ ملی تو آئینہ (مایوسی کے) پتھر سے چور چور ہو جائے گا۔ زیادہ مجبوری یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں، یہاں کی آب و ہوا خستہ حالوں کے لیے سازگار نہ ہونے کے سبب، شہر سے بھاگنا پڑے گا اور کسی دوسری جگہ سکونت اختیار کرنی پڑے گی۔ سال گزشتہ کے مئی کے مہینے سے جولائی 1858 تک کی روداد میں نے لکھی ہے اور یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش ان تین خواہشوں، خطاب، خلعت اور پنشن کے بارے میں، جن کی گزارش کا اس کتاب میں بھی میں نے ذکر کیا ہے اور اب بدبینوں کی نظر بچاکر، بڑی امیدوں سے دل ان کی طرف لگائے ہوئے ہوں، فیروز بخت، آفتاب افسر، آسماں تخت، جمشید حشم، فریدوں فر، کاؤس کوس، سنجر نشاں، سکندر پایہ شہنشاہ کے حضور سے منظوری کا فرمان پہنچ جائے، وہ شہنشاہ کہ بادشاہ روم اپنے تخت وتاج کی آبرو رہ جانے کے لیے اس کا منت گزار ہے اور لشکر آرائے روس کا دل اس کی لشکر کشی کے خوف سے دو نیم۔ اگر آفتاب یہ سوچ کر کہ جہاں سوزی اس کی ناخوشنودی کا سبب ہے، ڈرتا نہیں تو کیوں تمام دن، ہر آن کانپتا رہتا ہے اور اگر بدر روشن اس اندیشے سے کہ زمین کو منور کرنے میں اس کی ہم چشمی کا احتمال ہے، اس گستاخی کی معذرت نہیں چاہتا تو ہر رات خوف سے کیوں گھٹتا رہتا ہے۔

مالک تیغ و نگین و علم، سلطنت بخش اور بادشاہ ساز شہنشاہ دانشمند، فرخ شمائل، نیک طینت، انصاف میں نوشیرواں سے بازی لیے ہوئے۔

اس درخشاں علم کو جو جمشید کے پاس تھا، تو نہیں جانتا کہ جمشید سنبھال کر کیوں رکھتا تھا؟

اس لیے کہ اس زمانے میں، اس نامور شہریار کے سپرد کرے۔

خسرو کی طرف سے ترنج زر اور اس کے سات خزانے اسے بغیر زحمت اٹھائے تحفتہً ملے ہیں۔

وہ تخت (سلیمانی) بھی جسے ہوا اپنے دوش پر لے جاتی تھی، غیب کے فرشتے نے اسے نذر کیا ہے۔

تو نہیں دیکھتا کہ پہاڑوں میں پتھروں کے اندر سے قسم قسم کے جواہر نکلتے ہیں۔

(یہ اسی لیے ہے کہ) سورج کو اس کے تاج کی زیب و زینت مدنظر ہے، ورنہ اسے جواہرات سے کیا غرض۔

اگر وہ گوہر فشانی کا ارادہ کرے تو اس طرح موتی برسائے کہ ان موتیوں کی گنتی کی جائے تو گنتی کرنے والی انگلیاں گھس جائیں۔

اس کی فوج کے خوف سے، جو لڑائی کے وقت دریاؤں اور پہاڑوں سے گزر جاتی ہے،

دریاؤں کے نہنگ، پانی میں جان دے دیتے ہیں اور پہاڑوں

میں اژدہے، پتھروں سے سر ٹکرا کر مر جاتے ہیں۔
اس کی نمایاں شان و شوکت اور کر و فر کے سبب، روئے زمیں کے بادشاہ اس کے در کے گدا ہیں۔
یہ اسی کی بے دریغ ضیا بخشی اور کرم کوشی کا فیض ہے، جو سورج چمکتا ہے اور بادل پانی برساتے ہیں۔
اپنی بخششوں سے دانشمندوں کو نوازنے والی اور اپنی دانش آموزی سے لوگوں کو دانشمند بنانے والی۔
حیرت انگیز بخششیں کرنے والی اور عقل رسا رکھنے والی دانشمند فرماں رواو کشور یہ۔
پاک خدا ان کا محافظ رہے اور دنیا کی محفل میں وہ تا دیر سلامت رہیں۔
(کاش ایسا ہو کہ) میں بھی ملکۂ عالم کی بخششوں سے بہرہ یاب ہو سکوں اور دنیا سے ناکام نہ اٹھوں
جب سلسلۂ سخن یہاں تک پہنچا، میں نے خاموشی اختیار کی۔
میں داستان سرائی نہیں چاہتا۔
تکمیل کے بعد اس کتاب کا نام دستنبو رکھا گیا اور اسے دست بدست ادھر اُدھر بھیجا گیا کہ دانشوروں کی روح کو بالیدگی دے اور سخن گستروں کا دل ہاتھ سے چھین لے۔ امید ہے کہ یہ دستنبوئے دانش یزداں شناس لوگوں کے ہاتھ میں رنگ و بو کا گلدستہ ہوگا اور اہرمن منش لوگوں کی نگاہ میں آتشیں گیند۔ آمین۔
ہماری طبیعت ہر وقت رواں رہتی ہے۔ ہم آسمانی رازوں کا سرچشمہ ہیں۔
ہماری نگارش دساتیر کا حصہ ہوتی ہے ہم کاروانی میں (گویا) ساسان ششم ہیں۔ (تمام شد)

فارم IV

(حسبِ قاعدہ) بابت "اردو دنیا"، نئی دہلی

(1)	مقام اشاعت	:	ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110
(2)	وقفہ اشاعت	:	ماہنامہ
(3)	پرنٹر و پبلشر کا نام	:	ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
	قومیت	:	ہندستانی
	پتا	:	ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110
(4)	ایڈیٹر کا نام	:	ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
	قومیت	:	ہندستانی
	پتا	:	ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110
(5)	مالک	:	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 66

میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

محمد حمید اللہ بھٹ

رتن ناتھ سرشار　　　　فسانۂ آزاد، جلد اوّل سے اقتباس

لکھنؤ کا محرم الحرام

سینوں میں جگر پہ تیرِ غم چلتے ہیں
رخساروں پہ اشک شمع ساں ڈھلتے ہیں
کیوں تعزیہ خانوں میں نہ رونق ہو زیاد
دل بھی تو چراغوں کی طرح جلتے ہیں

میاں آزاد سیلانی آدمی، سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہوئے۔ مٹر گشتی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سوچے کہ چل کے محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون وشین، گھر گھر بکا و بین، گریہ وزاری، اشکباری، جمِ غفیر، مجمعِ کثیر۔ ایک جلے تن بول اٹھے اور کیوں نہ ہو، مجالس عزا کی دھوم دھام ہے۔ لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی، لکھنؤ کی عزاداری، لکھنؤ کی سوگواری، از شام تا روم، مشہور ہر مرز بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم، امام باڑوں میں ہجوم ہے۔ اور ان سب میں حسین آباد مبارک کا بدر فی النجوم ہے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک دوست بھی ہو لیے تھے۔ ان کی بے قراری کا حال کچھ نہ پوچھیے، وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے۔ لوٹے جاتے ہیں، کہ شہیدِ کربلا کا واسطہ، آلِ مصطفےٰ کا صدقہ، ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھادو۔ مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے ایک آہِ سرد کھینچ کر کہا کہ میاں اب وہ لکھنؤ کہاں، وہ لوگ کہاں، وہ دل کہاں، لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جانِ عالم کے وقت میں دیکھتا تو ارنی گوئے اوجِ طور بھی غش کر جاتا، بانکوں کی شمشیر دو پیکر، جب دیکھو میان سے دو انگل باہر۔ کسی نے ذرا تیکھی چتون کی، اور انھوں نے کھٹ سے سر وہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ ہنڈارا کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹے میں بیس بیس خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی۔ دکاندار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر سٹک جاتے تھے۔ وہ دھم دھکا، وہ بھیڑ بھڑ کا ہوتا تھا کہ واہ جی واہ۔ انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا۔ اب کوئی بھی نذر حسین نہیں نکالتا ہے۔ اب انیسؔ ہیں نہ دبیرؔ، مونسؔ ہیں نہ مشیرؔ، ضمیرؔ ہیں نہ دستگیرؔ:

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا گل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دبیرؔ مبرور کی تربت کو خدا عنبریں کرے، واللہ خدائے سخن تھا سر ممبر:

جب قفلِ دہن کھلا جواہر نکلے
گویا کہ زبان کلیدِ گنجینہ ہے

ایک ہی رباعی پڑھی اور سامعین چار موجہ حیرت میں غرق ہو گئے۔ کہ اللہ اللہ یہ فصاحت یہ بلاغت:

مدّاح امیر ابن امیر آتا ہے
دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاقِ سخن، خلق چلی آتی ہے
لو مرثیہ پڑھنے کو دبیرؔ آتا ہے

اور انیسؔ مغفور کو خدا بخشے باللہ العظیم کلام کیا جواہرات کے ٹکڑے، قند و نبات کے ریزے، نور کے مرصعے ہیں:

ع۔ جوہر شناس ہے تو انھیں موتیوں میں تول

فصحائے خطۂ پاک ایران تک کہتے ہیں کہ کجا انیسؔ کجا فردوسی، کجا کمر بندِ مرصع کجا شالِ طوسی، بزم میں وہ ڈھنگ رزم میں وہ رنگ کہ:

مضمونِ انیسؔ کا نہ چربا اترا
اترا بھی تو بگڑ کر نقشا اترا
نقاش نے سو طرح کی خلقت کھینچی
تصویر نہ کھنچ سکی تو چہرا اترا

لیکن ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔ اب بھی اس شہر کی ایسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔ اب کہیے کہاں کی سدھیاں ہیں۔ نجف اشرف، کربلا کاظمین، میر باقر کے امام باڑے، چوپٹیاں۔ جہاں چلو داخلِ حسنات ہو، واللہ بہشت کی بھی کیا سیدھی راہ ہے:

دربارِ جنابِ مصطفےٰ کو دیکھا
ان آنکھوں سے شانِ کبریا کو دیکھا
فردوس میں پہنچے جو نجف میں پہنچے
جنت دیکھی جو کربلا کو دیکھا

رنگ رلیاں مناتے پو قدمے چلے جاتے تھے، راہ میں وہ بھیڑ، وہ ریل پیل، کہ عیاذاً باللہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ ہوا جب بعد خرابی بصرہ کہیں

● فسانۂ آزاد کلاسیکی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ فنی اعتبار سے یہ داستان اور ناول کے درمیان کی صنف ہے۔ فسانۂ آزاد نہ صرف زبان و بیان اور معاشرے کی عکاسی کی وجہ سے بلکہ اپنے دلچسپ کرداروں کے اعتبار سے بھی پرکشش ہے۔ فسانۂ آزاد کا دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے۔

گزر پائے، تو ضیق النفس ہو جائے۔ بانکے ترچھے تیکھے، مقامات مقدس کس و ناکس، غریب و امیر، برنا و پیر، الڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو نرالی سج دھج۔ مومن پاک، مثلِ کعبہ سیاہ پوش، کوئی ماتم حسین میں برہنہ سر چلا جاتا ہے، کوئی خلہ پوشانِ بہشت کی طرح ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔ حسینانِ عنبریں مو اور مہ جبینانِ قوس ابرو کی مستانہ چال، ماتمی پوشاک، بکھرے ہوئے بال، واہو اوہ ناز۔ وہ نگاہ غلط انداز، وہ چھپ چھپ کر کترا جانا، کبھی لجانا، کبھی مسکرانا۔ بے فکروں کی سو سو چک پھیریاں۔ تماشائیوں کی زور آزمائیاں۔ عاشق تنوں کی گھاتیں۔ رمز و کنایہ کی باتیں۔ دیہاتنیں، گنوارنیں، بیندی لگائے پھریا پھڑکائے، گوندے پٹیاں جمائے، حیرت سے باہم چہ میگوئیاں کر رہی ہیں:

اری دیدی تنک مہکا بتادے
یہ کندیلیں جو لٹکت ہیں یہ درماں
حسین آباد تو پھر پھر ہے بیکنٹھ
برت ہے یاں دیا لکرن کے گھرماں

لیجیے آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل۔ او ہو ہو خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے۔

واہ میاں باقر کیوں نہ ہو، نام کر گئے۔ چکاچوند کا عالم ہے۔ لیکن گلی تنگ، تماشائیوں کی عقل دنگ۔ ع: جائے تنگ ست مرد ماں بسیار۔ مگر خلقت گھس پیٹھ کر دیکھ ہی آتی ہے۔ ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے، آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے۔ وہاں سے جو طرارہ بھرا تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پیر فرتوت دقیانوس کے ہم عصر بیٹھے، اگلے وقتوں کے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واللہ لکھنؤ کے کمہار بڑے نادرہ کار ہیں۔ ایسا بڈھا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے پوپلے منھ سے اب بولا اور اب بولا۔ وہی سن کے سے بال۔ وہی سفید بھویں۔ وہی چتون، وہی پیشانی کی شکن، وہی ہاتھوں کی جھریاں، وہی کمر خم، وہی سینہ جھکا ہوا۔ واہ رے کاری گر، تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے۔ اور تیرا بڑھوا تو اللہ ہی اللہ۔ وہاں سے جو چلے تو داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم کے امام باڑے میں آئے۔ یہاں سورج مکھی پردہ جوبن تھا کہ آفتاب اگر ایک نظر چھپ چھپا کر، وہ دیکھ پاتا تو مارے غیرت کے بحر ظلمات میں غوطے کھاتا۔ بے تکلف کرسیوں پر جاڈٹے۔ اہلکارانِ سلیقہ شعار نے الائچی، چکنی ڈلی، پیش کش کی۔ وہاں سے حسین آباد مبارک میں پہنچے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضواں۔ الٰہی یہ مکان ہے یا باغ جناں۔ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرامگاہ کا نام روشن ہے۔ امام باڑہ سجا سجایا۔ دُلہن کا ایسا جوبن ہے۔ برجوں پر ضیائے موفور۔ تو منار نور علیٰ نور۔ حیرت تھی کہ یہ کوہ ہے یا شعلہ طور ہے۔ سُرخ قندیل پر یاقوت احمر ہیرا کھائے۔ چراغاں کی قطار پر مہتاب پروانہ ہو جائے۔ پھر نہر مصفا جو نظر آئی، تو آنکھوں نے عجب طراوت پائی:

مؤثر ہچوم چشم تیز بیناں
مصفا چوں دلِ خلوت گزیناں
رسیدہ عمق اوتا گاؤ ماہی
نمودہ ہچو عینک در سیاہی
پئے کسب لطافت آب حیواں
وروکشتہ چوذرد ازتہ نشیناں
بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جاوے
یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

اب ان کے دوست کو شوق چرایا، کہ اربابِ نشاط کے امام باڑوں کی زیارت کریں تو میاں میاں آزاد جھجکے۔ اے حضرت خدا خدا کیجیے۔ بندہ ایسی جگہ نہ جانے کا، اپنی وضع کے خلاف ہے۔

دوست : بھئی واللہ کتنے روکھے پھیکے آدمی ہو۔ ارے میاں حیدر کی نازک آوازی، مشتری کی جادو طرازی، گوہر کی چمک دمک، آبادی کے رخِ انور کی جھلک سے کانوں کو سرور، آنکھوں کو نور، نہ حاصل ہوا تو لکھنؤ کا محرم کیا خاک دیکھا۔ اور پیر مرشد خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے، کہ انھیں دس دن تو مزے سے جہاں چاہیے جائیے۔ رنگین کمروں پر دو گال ہنس بول آئیے۔ بچے اور بوڑھے سب پہنچتے ہیں۔ مضمون واحد ہے۔

آزاد : یہ کہیے تو خیر۔ چلیے بندہ بھی لہو لگ کر شہیدوں میں داخل ہو جائے۔ پہلے گوہر کے یہاں پہنچے۔ اللہ اللہ دماغ عرش بریں پر ہے۔ اچھے اچھے رئیس زادے فخریہ مصاحبت کر رہے ہیں۔ ایک بڑے مالدار جوہری صاحب مٹکتے ہوئے آئے۔ دس روپیہ کی کارچوبی ٹوپی زیب سر، فاسی، طلس کا نوق البھڑک دگلہ، زیب بر سنہری لیس ٹکی ہوئی، یک رنگ جوڑا۔ خاصے مرغ زریں بنے ہوئے۔ خدمت گار کے کاندھے پر زنگاری دو شالہ۔ یہ وضع یہ قطع۔ مگر بیٹھتے ہی ٹوکے گئے۔ بیٹھے تو ضریح کی طرف پشت کر کے۔ صاحبِ خانہ نے ایک عجیب ادا رے دلربا سے جھڑک دیا۔ اے واہ بڑے خوش تمیز ہو۔ ضریح مبارک کی طرف پشت سیدھے بیٹھیے آدمیت کے ساتھ۔

جوہری : ماجلا (معاذاللہ) بیوی مجھے بیٹھ نہیں آتا۔

میاں آزاد نے چپکے سے دوست کے کان میں کہا۔ لاحول ارے میاں یہ باایں ہمہ تمیم ٹام گھڑ کے گئے۔ اور ذرا چیں بچیں نہ ہوئے۔ پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

دوست : بھائی جان! گوہر جان، لکھنؤ شان، لکھنؤ آن بان، لکھنؤ روح

رواں، لکھنؤ ہے۔ رگ رگ میں شوخی:

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

ایسا خوش قسمت کوئی ہو تو لے، کہ اس بتِ عربدہ جو کی گھڑکی ہے۔ حاضرین ادب سے گردن جھکائے بیٹھے ہیں۔ جسے دیکھو دزدیدہ نگاہ سے محوِ نظارہ بازی ہے۔ لیکن رعبِ حسن سے بات کرتے کلیجہ لرزتا ہے۔

غرورِ حسن اجازت مگر نداوائے گل
کہ پرسی یکی عندلیب شیدارا

یہاں سے درد کی طرح اُٹھے تو فرنگی محل میں حیدر جان کے یہاں پہنچے:

نکلے خیمہ سے جو ہتھیار لگائے عباس
چڑھکے رہوار پہ میدان میں آئے عباس

اس سوز کو ایسی نازک آوازی سے، سارنگ کی مانجھ میں ادا کیا کہ سامعین لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ راگ اور راگنی تو اس کی لونڈیوں کا نام ہے۔ اوہو، ہو، ہو، کی صدا ہر در و دیوار سے بلند تھی۔ واللہ کیا پیارا گلا پایا ہے۔ میاں آزاد کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہو گئی تھی۔

اب پھدک کر بی منجھو مشتری کے کمرے پر پہنچے۔ ان کی لفاظی ان کی جادو طرازی، ان کی خوش بیانی، ان کے طرزِ سوز خوانی کی دھوم ہے۔ اربابِ صافی مذاق کا ہجوم ہے کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں:

ع۔ خنجر جو بوسہ گاہِ پیمبر پہ چل گیا

اس کو جھنجھوٹی کی دھن میں اس لطف سے پڑھا کہ سامعین سر دھننے لگے۔

دوست: کیوں یار کیا لکھنؤ میں زیور پہننے کی قسم ہے؟

آزاد: لاحول ولاقوۃ تم بالکل ہی گنوار ہو۔ ماتم میں زیور کا کیا ذکر، گورے گورے کانوں میں، کالے کالے کرن پھول۔ ہاتھوں میں سیاہ سیلی بس کافی ہے:

سیاہ سیلی بدست آں نگاری
بشاخ صندلی پیچیدہ ماری

لیکن یہ سادگی بھی عجب لطف دکھاتی ہے۔ چلیے ذرا مجالسِ عزا کا رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھیں۔ نواب باقر حسین خاں بہادر اور داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم اور جناب سید العلما مہر سپہر شرع و دینداری سید ابراہیم صاحب، اور جناب آغا علی خاں صاحب سابق ناظم کی مجلسوں میں گئے۔ ماتم داران جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا اور زائرینِ مصائبِ خاکِ آلِ عبا کی اشکباری اور گریہ وزاری سے یقین کامل ہو گیا کہ ماتم داری لکھنؤ پر ختم ہے۔ عاشورے کی رات تو نچوڑ کا دن تھا۔ آزاد نے لکھنؤ کے محرم کا خوب لطف اُٹھایا:

الوداع اے اشکبارو الوداع
آخری یہ شب ہے یارو الوداع
عشرۂ ماہِ عزا کا ختم ہے
سر کو پیٹو اور پکارو الوداع

جدھر جاتے ہیں آوازِ گریہ وزاری۔ جسے دیکھتے ہیں صرف اشکباری رات تو زیارت میں بسر ہوئی:

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازی پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیٰ زُہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک جب ہوئی

یعنی عاشورہ کے دن پو پھٹنے کے وقت تعزیہ نکلے۔ رانگے کا تعزیہ، جو کا تعزیہ، موم کا تعزیہ، کھیلوں کا تعزیہ، روئی کا تعزیہ، پیپل کے پتوں کا تعزیہ، انڈوں کا تعزیہ، نوگزہ تعزیہ۔ لاکھوں تعزیے تالکٹورے کی کربلا میں دفنائے جاتے ہیں۔ اربابِ نشاط برہنہ سر، برہنہ پا سیاہ ماتمی پوشاک نے ان کے جوبن کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا لیکن:

رومال نہ اشکوں سے بھگونے پائے
مُنہ آبِ گہر سے بھی نہ دھونے پائے
کیا جلد ہوا ماہِ محرم آخر
جی بھر کے حسین کو نہ رونے پائے

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلیٰ درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ کے لیے خصوصی رعایت

پتا: قومی اردو کونسل برائے فروغِ اردو زبان
ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

رشید الدین خاں "مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام" سے اقتباس

مولانا آزاد کے دو بڑے سیاسی کارنامے

مولانا آزاد کے دو سیاسی کارنامے، ہندستانی قومیت کی بڑی میراث ہیں، ایک نظریاتی اور ایک عملی۔ ایک اجتہادی اور ایک مجاہدانہ! ان کا نظریاتی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تعلیماتِ قرآنی اور، رسول کریم کے اسوۂ حسنہ اور تاریخ اسلام کی روشنی میں، متحدہ قومیت کے شرعی اور مذہبی جواز کا ایک عالمانہ استدلال پیش کیا، جو اپنے اجتہادِ فکر، جرأتِ ایمانی اور خلوصِ سیاسی کا ایک لاجواب نمونہ ہے۔

ان کا عملی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے متحدہ قومیت کی سیاست اور مشترکہ گنگا جمنی تہذیب Composite Culture کی روایات کو تحریکِ آزادی کے زمانے میں اجتماعی قومی زندگی کی اساس بنانے اور آزادی کے بعد اس کو ہندستان کے نئے سیکولر جمہوری نظام سے وابستہ اور منسلک کرنے میں اپنی کاوشوں اور تمناؤں کا بنیادی مرکز بنالیا تھا۔ ان کی زندگی کا بہترین حصہ اسی جستجو کو عملی روپ پہنانے میں صرف ہوا۔

ان دو کارناموں کو ہندستان کی قدیم اور مسلسل تاریخ اور پیچیدہ سماجی پس منظر میں دیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمیں ایک طرف مسائل کی پے در پے مشکلات کا اندازہ ہو اور دوسری طرف ہم خلوص سے مولانا کے عزم اور یقین کی داد دے سکیں اور میر کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ہندستان اور چین، دنیا کے دو ہی ممالک، بلکہ ان کو برصغیر کہنا چاہیے، ایسے ہیں جن کا تمدن بے رخنہ اور بغیر قطع ہوئے ہزاروں سال سے قائم و دائم ہے۔ uninterrupted civilization عہدِ عتیق میں کئی تمدن اُبھرے اور مرورِ زمانہ سے تہ و بالا ہوگئے، بعض کے کچھ آثار ابھی بھی باقی ہیں۔ بہت سے تمدن با تسلسل باقی نہیں رہے، گو ملکوں کے نام وہی باقی رہ گئے، جیسے مصر، یونان، روم یا بعض ختم ہی ہوگئے جیسے اسیریا، سومیریا، ازٹک میکسیکو وغیرہ۔ اقبال نے اسی تاریخی حقیقت کی طرف بڑا حکیمانہ اشارہ کیا ہے، جس کو اپنی مختلف تقریروں میں جواہر لال نہرو دہرایا کرتے تھے کہ ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
یونان و مصر روما سب، مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

مگر چین اور ہندستان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ چین میں یکرنگی زیادہ ہے، کیوں کہ اس کی آبادی کی اکثریت ہان قبیلہ (Han race) کی شاخوں میں منقسم ہے، گو کچھ اور قبیلوں اور نسلوں کے لوگ بھی ہیں۔ جیسے مان، چن، ہوئی، اویگر، تبتی وغیرہ۔ ہوئی اور اویگر مسلمان ہیں اور تبتی لاما بودھ مت کے ماننے والے ہیں۔ برعکس اس کے ہندستان کی تاریخی خصوصیت ہی یہ رہی ہے کہ صدیوں سے دریا کی موجوں کی طرح، جوق در جوق قبائلی قافلے، نسلوں کے کارواں آتے رہے، بستے رہے، اور اس مردم خیز دھرتی کو مالامال کرتے رہے۔ یہ انسانی غول، تاریخ کے ہر عہد میں آتے رہے، خصوصاً شمال مغرب سے، گو کچھ شمال مشرق سے بھی آئے، اور دلکش و خوشگوار وادیوں میں، دریاؤں کے کنارے، اپنی آرزوؤں اور اُمنگوں کی کھیتیاں لہراتے رہے۔ گنگا، جمنا، راوی، بیاس، جہلم، ستلج، نربدا، گوداوری، مہاندی، کرشنا اور برہمپتر، ان سب کے کنارے ہماری تاریخ کی رنگارنگی کی داستان پھیلی ہوئی ہے، اس لیے اقبال کی زبان میں فخریہ ہم یہ گاتے رہے کہ ؎

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر جو انسانی قافلے یہاں آئے، وہ اپنے ساتھ بعض ورثے بھی لائے۔ پے در پے، زبان کے، بیان کے، عقیدے کے، فکر کے، رسم و رواج کے، طریقۂ حیات کے، رہنے سہنے کے، گانے اور موسیقی کے، کھانے اور ضیافت کے، غرض زندگی کی سب ہی کاوشوں اور اُمنگوں کے ورثہ بھی آئے۔ اس کے ساتھ یہاں پہنچ کر، اور دیگر انسانی گروہوں سے میل جول اور ردّ و قدح کے بعد مختلف قسم کے اچھے اور بُرے روابط اور مراسم قائم ہوئے، جن کے نتیجے میں کچھ اور نئے ورثے تیار ہوئے جو گوناگوں تعلقات پر حاوی تھے — جیسے محبت اور عداوت، دوستی و دشمنی، رشک و حسد، صلح و جنگ، بھروسہ و بدگمانی، منافقت اور ملنساری، رفاقت اور رقابت، وفاداری اور جفاکشی، غرض بزم کی دلگیریوں اور پشیمانیوں اور رزم کی دلآزاریوں اور دلبستگیوں، سب ہی قسم کے

انسانی تجربوں اور حالتوں کا ایک پس منظر ابھر اور کچھ نئے ورثے بنے۔

ہندستان کی تاریخ میں دو مختلف عہدوں میں دو بڑے انسانی قافلے یہاں آئے، جن کے کارنامے، حیات سماجی اور تہذیب میں پوری طرح پیوست ہو گئے۔ عہد عتیق میں انڈو۔ آرین قافلہ اور عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کے قافلے جو افغانستان، ایران، توران اور ماوراءالنہر کے مختلف علاقوں سے اور مختلف قبیلوں پر منقسم آئے۔ جیسے پٹھان، ازبک، تاجک، ترکمان، بلوچ، بختیاری وغیرہ۔ عہد عتیق میں سب سے بڑا اور بااثر قافلہ جو تاریخ کی پہلی کرنوں کے ساتھ یہاں پہنچا وہ تھا آریہ نسل کا، جس کے پیدائشی مسکن کے بارے میں مختلف تاریخی شواہد اور قیاس آرائیاں اور مختلف ساجیاتی نظریے ہیں۔ یورپ کے بیچ بستہ بالٹک علاقے سے لے کر، قفقاز کی حسین وادیوں تک ان کے گہوارے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بعض محققین ان کی اصلی جائے پیدائش درمیانی یورپ، خصوصاً ہنگری کے قرب و نواح میں متعین کرتے ہیں۔ آریہ نسل کی کئی شاخیں، دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل گئیں۔ ایک ایران میں جا بسی، ایک نے جرمنی کا احاطہ کیا، اور دوسرے دریائے سندھ کو پار کر کے بھارت ورش میں پھیل گئی۔ یہی انڈو۔ آرین ہیں جنھوں نے ہم کو رگ وید اور دیگر تین وید دیے اور ان میں اوپنیشد کا عالمگیر فلسفہ حیات و ممات دیا، جس کی وجہ سے ہم مولانا آزاد کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ:

"دنیا میں وحدت الوجود (Pantheism) کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندستان ہے۔"

(غبار خاطر، نوٹ 4' 120)

یاد رہے کہ وید مقدس نے ہی ہندستان کو ہندستان بنایا، اس معنی میں کہ دنیائے علم و تقدس، فلسفہ اور رموز حیات میں قدیم انسانی حکمت کا سرچشمہ اس خزانۂ فکر و محاکات سے پھوٹا اور ہماری تہذیب کے فکر و اخلاقیات کے ادب عالیہ (Classics) کا بھی وہی مخزن رہا۔ اس ملک کا بنیادی اور اکثریتی عقیدہ جس کو عرف عام میں آج ہندو ازم کہا جاتا ہے، اس کا اہم اثاثہ ویدانت کا ہی نظریۂ عالم، حیات اور انسان ہے۔ ہندو مذہب کے بنیادی صحیفوں میں رامائن اور مہابھارت، اور اس میں گیتا کی تعلیمات کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہی وہ خزانہ ہائے عرفان و وجدان ہیں جن پر ہماری مسلسل چار ہزار سال پرانی تہذیب اور اس کی قدروں اور مفروضوں کا دارومدار ہے۔

مسلمانوں کے قافلے جنھوں نے عہد وسطیٰ میں مختلف اوقات اور مختلف حالات میں سرزمین ہند کا رخ کیا ان کے محرکات سفر و ہجرت محض مذہبی نہیں تھے۔ یہ سمجھنا تاریخ کے واقعات کے مغائر ہوگا کہ یہ قافلے مجاہدین دین کے یا غازیان اسلام کے تھے۔ کچھ ایسی موجیں بھی ساحل ہند سے ٹکرائیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ حکمرانی اور سلطنت آرائی کے خواب لے کر بھی کچھ قبائل، یہاں فتوحات کی مہم میں سرگرداں رہے اور اپنے جبر واستبداد اور تلوار کے زور سے پسماندہ طبقوں کو اپنے عقائد کے زمرے میں شامل کر لیا۔ مگر زیادہ اور مسلسل لہریں ان مسلمانوں کی تھیں جو زرخیز زمین کی تلاش میں یا اپنے فن اور ہنر کی قدردانی کی جستجو میں، کامیاب حکمرانوں کی فوج میں بھرتی کے لیے، نئی نئی سلطنتوں میں گوناگوں نوکریوں میں قسمت آزمائی کرنے، مختلف ذرائع معاش اور زندگی کے نئے گہواروں کی آرزو میں یہاں آئے اور ہندستان کو اپنا وطن بنایا۔ غرض مختلف اور متنوع محرکات نے انھیں ہندستان کی طرف کھینچا اور ایسا کھینچا کہ پھر پشتہا پشت وہ اسی مادر وطن میں پروان چڑھے اور مر کر اسی خاک میں پیوست ہو گئے۔

ہندستان میں اسلام، پانچ مسلم اقتدار کے مراکز سے آیا — عرب، افغانستان اور ایران، توران اور ماوراءالنہر۔ سندھ، کچھ، مالابار اور کورومنڈل میں عرب سے مسلمان آئے، پنجاب اور گنگا جمنا کے دوآب میں، وندھیاچل، دکن اور بنگال میں، مختلف قافلے افغانستان، ایران، توران اور ماوراءالنہر (یعنی سمرقند، بخارا، خیوا، فرغنہ، بلخ و بدخشاں وغیرہ) سے آئے۔ فقہ کے لحاظ سے ہندستان میں زیادہ تر حنفی المذہب ہیں۔ جنوب میں شافعی مذہب کے گروہ ہیں اور فقہ امامیہ کے پابند۔ اہل تشیع ملک کے مختلف علاقوں میں کہیں کم اور کہیں زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ مغربی ساحل پر خلیج عرب کے آس پاس تاجر پیشہ مسلم فرقے جیسے خوجہ جو اسمٰعیلی ہیں، بوہرے، میمن وغیرہ آباد ہیں۔

مذاہب کے لحاظ سے ہندستان میں آٹھ مذہب کے پیرو رہتے ہیں۔ ہندو، مسلمان عیسائی، سکھ، بدھ متی، جینی، زرتشتی پارسی اور یہودی۔ ان کے علاوہ مختلف قسم کے بت پرست اور قبائلی عقیدوں کے گروہ بھی ہیں۔ شاید دنیا کے کسی ملک میں، انسانی عقیدوں کی اتنی فراوانی نہیں ہے جتنی ہندستان میں۔ ظاہر ہے کہ مذاہب کی اس رنگارنگی میں متحدہ قومیت کے استحکام اور تقویت کا مسئلہ قدرے پیچیدہ اور مشکل الحل ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد اس سے واقف تھے اور اسی وجہ سے 1920 کے بعد انھوں نے اپنی پوری توجہ، مہاتما گاندھی کی قیادت میں، اس بنیادی تعمیری کام میں لگا دی، اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں انھوں نے تقریباً نصف صدی کا زمانہ صرف کیا۔

متحدہ قومیت کی اہمیت اور اس میں مسلمانوں کی ضروری شرکت، وہ عنوانات تھے، جن پر مولانا آزاد نے بہت کچھ لکھا اور اپنی کئی تقریروں میں

ان پر روشنی ڈالی۔ اسی طرح جمہوری وفاقی نظام کے مضمرات کے بارے میں مولانا آزاد نے مختلف مواقع پر ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

الہلال کے 18/دسمبر 1912 کے شمارے میں مسلمانوں کو عبرت دلاتے ہوئے بڑے جلالی انداز سے لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندستان کا سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی بیڑیاں جو اُس نے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو چکے گا، جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کرو کہ اس وقت ہندستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اُس میں سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا ہوگا؟ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طائع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں ایک سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دستِ اجانب میں بازیچہ لعب، ہندستان کی پیشانی پر ایک کبر از فم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی۔"

(عرشِ ملسیانی نوٹ (1) ص 54)

اس قسم کے دلوں کو ہلا دینے اور دماغوں کو جھنجھوڑنے والے آتش فشاں مضامین، انگریز حکومت کے لیے وبالِ جاں بنے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے مولانا کو 1916 میں کلکتہ اور بنگال سے نکال دیا گیا تھا، اور وہ رانچی میں چار سال محصور زندگی گزارتے رہے۔ اسی زمانے میں گاندھی جی نے کئی مرتبہ ان سے ملنے کی کوشش کی مگر انگریز حکومت نے انھیں اجازت نہیں دی اور ان دو قائدین کی ملاقات 1920 تک ملتوی رہی۔

مولانا آزاد نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی عالمگیر انقلابی تبدیلیوں میں ترک اور عرب قومی تحریکوں سے یہ بنیادی سبق سیکھا کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں ہوتی بلکہ قوم کے مختلف عناصر کے امتزاج سے یہ اُبھرتی ہے اور ایک نیا سیاسی شعور پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے اس بنیادی حقیقت کو سمجھ کر یہ مان لیا کہ قومیت کی اساس مذہب سے ماوراء سماجی تشخص، علاقائی وحدت (territorial unity) اور سیکولر سیاسی محرکات پر مبنی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ اعتراف خود ان کے لیے بھی نیا تھا، کیوں کہ 1920 تک وہ علاحدہ مسلم حب الوطنی اور عالمگیر اسلامی اخوت کے قائل تھے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں سیکولر، علاقہ واری قومیت کا کوئی ذکر اس وقت تک نہیں تھا۔

مولانا نے کل ہند خلافت کانفرنس کو کانپور میں 29/دسمبر 1925 کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندستان کے موجودہ منظر کا سب سے زیادہ دردانگیز پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب مشرقی ممالک کے موجودہ تغیرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے۔ جب کہ مشرق کی تبدیلیاں آزادی اور ترقی کی طرف جارہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک قدم اُٹھا کر صرف تھک ہی نہیں گیا ہے، بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے۔۔۔ ہندستان کی طرح شام میں بھی مختلف مذاہب اور نسل کی مشترک آبادی ہے، وہاں کے دروزی قبائل (Druze) عام مسلمان اور مسیحی جماعتیں، صدیوں سے باہم دگر قتل و غارت میں سرگرم رہی ہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے مذہبی اختلافات کے لیے صرف صلیبی لڑائیوں (Crusades) ہی کا افسانہ کافی ہے، جس کے آٹھ خونی سیلاب اسی سرزمین میں بہہ کر خشک ہو چکے ہیں۔ تاہم آج اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان سب کا متحدہ نعرہ ہے۔ اَلدِّیْنُ لِلْوَاحِدِ وَالْوَطَنِ لِلْجَمِیْعِ وطن سب کے لیے ہے اور ہر شخص کا دین اس کے لیے ہے۔ لیکن ہندستان کا کیا حال ہے؟ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیمی اور سیاسی پیداوار بھی آج اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں — مذہبی منافرت، جماعتی تعصب، فرقہ وارانہ تنگ دلی، اور محکومانہ ذہنیت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑے ہیں۔"

(خطباتِ آزاد، نوٹ 22، ص 213)

مولانا آزاد کی رام گڑھ کانگریس کے سالانہ جلسہ کی مارچ 1940 کی صدارتی تقریر شاید ان کی آخری جامع تقریر ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے فوائد اور علاحدگی کی سیاست کے مضمرات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بڑی صفائی سے انھوں نے یہ کہا تھا کہ مسلمان نہ تو معمولی اصطلاح میں اقلیت ہیں اور نہ ان کو سیاسی اقلیت ہونے کا بیجا احساس ہونا چاہیے، کیوں کہ برٹش انڈیا کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں تو ان کو اکثریت حاصل ہے (اور اگر بلوچستان کو شمار کیا جائے تو پانچ ہیں)۔ انھوں نے انگریز سامراج کی تفرقہ پرور حکمتِ عملی کا رول واضح کیا اور کہا کہ مستقبل میں جب ہندستان وفاقی اور جمہوری دستور بنے گا اس میں مختلف اکائیوں (units) کو خود اختیاری (autonomy) حاصل ہوگی، تاکہ وہ اپنے اندرونی معاملوں کو اپنے اپنے انداز سے حل کر سکیں۔ بہرحال مولانا

آزاد ملکِ شام کے کامیاب متحدہ قومیت کے تجربے کو پیشِ نظر رکھ کر، یقین رکھتے تھے ہم بھی ہندستان میں یہی کر سکتے ہیں، اگر بالغ النظری اور سیاسی فہم سے کام لیں۔

مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی تعمیر میں مشغول کرنے کے لیے مولانا آزاد نے تاریخِ اسلام کے زریں عہد، یعنی عہد نبوی سے اسوۂ حسنہ پر مبنی ایک انوکھا جواز پیش کیا۔ ہجرت کے پہلے ہی سال میں (یعنی 623ء) رسول اکرم نے، مدینہ اور اس کے قرب و نواح کی حفاظت، دفاع اور بہبودی کے لیے، مہاجر اور انصار مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذہبی گروہوں، جن میں یہودی، نصرانی، صابی (Sabaeans)، ماگی (Magians) اور بت پرست قبائل بھی شامل تھے، سب کو ملا کر ایک سیاسی گروہ کی شکل دی، تاکہ مخالف قریش مکہ اور دیگر سرکش قبائلیوں کی یلغار سے باشندگان محفوظ رہ سکیں۔ اس انتظام کو باقاعدہ شکل دینے کے لیے، رسول کریم نے ایک قانونی دستاویز خود تیار فرمائی جس کو تاریخ میں "میثاقِ مدینہ" یا "عہد نامہ مدینہ" یا "دستورِ مدینہ" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس عہد نامے کی رو سے، سماجی اصلاح کے بعض اہم مسائل پر مختلف مذاہب اور عقیدوں کے پیروؤں نے اتفاق کیا، اور اس طرح اپنے اشتراک کو ایک قانونی اور سیاسی شکل دی۔ مثلاً سب نے اقرار کیا کہ بعض قدیم غیر انسانی روایات کا خاتمہ ہونا چاہیے، جیسے اس رواج کا کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے۔ عرب کا ایک دوسرا عجیب رواج تھا جس کی رو سے نہ صرف دولت بلکہ فوت ہونے والے مرد کی بیویاں بھی ورثے میں آتی تھیں۔ اس رواج کو ختم کرکے یہ ترمیم منظور ہوئی کہ صرف دولت ہی ورثے میں مل سکتی ہے، بیویاں نہیں۔ پھر یہ بھی مان لیا گیا کہ اصل پر زیادہ سود ناجائز ہے، غلاموں کی رہائی نیک عمل ہے۔ ایک متفقہ عدالت کا قیام بھی عمل میں آیا تاکہ قانون میں یگانگت اور مساوات قائم ہو سکے۔ اس عہد نامے کے دیباچہ میں ہی رسول کریم نے اس مختلف مذاہب اور عقیدوں پر منقسم سیاسی گروہ (multi-religious political group) کو "اُمتہ الواحدہ" کہا ہے۔ اس کا ترجمہ بعض مفسرین نے "ایک لوگ" (one people)، بعض نے "ایک فرقہ" (one community) اور بعض نے "ایک قوم" (one nation) کیا ہے۔ مولانا آزاد نے "اُمتہ الواحدہ" کو ایک قوم ہی قرار دیا ہے۔

یاد رہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ میثاق کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ مسلمانوں اور یہودیوں میں تعلقات خوشگوار قائم نہ رہ سکے، بلکہ اس میثاق کے باوجود اور خلاف ورزی میں مدینے کے یہودیوں نے مخالف قریش مکہ کے ساتھ سازباز کی، جس کی وجہ سے رسول کریم کا رویہ ان کی طرف سے بالکل تبدیل ہو گیا، اور بالآخر یہودی عرب سے نکال دیے گئے۔ مولانا آزاد ظاہر ہے کہ اس تاریخی واقعے سے بخوبی واقف تھے، لیکن ان کا مقصد صرف یہ بتلانا تھا کہ رسول اکرمؐ نے مختلف مذاہب کے متحدہ سیاسی گروہ کو "اُمتہ الواحدہ" قرار دیا تھا، اور یہ کہ ایسا سیاسی اتحاد اسلامی تاریخ میں ممکن تھا اور اسلامی اصول کے لحاظ سے جائز ہی نہیں بلکہ رسول اللہؐ کے بتائے ہوئے طریقۂ کار کے عین مطابق ہے۔ ان کی سیاسی فہم یہ تھی کہ متحدہ قومیت کے استحکام کے لیے "اُمتہ الواحدہ" کے نظریے کا اطلاق مناسب اور موزوں ہے۔ مولانا آزاد سے پہلے کسی نے اس نظریے کی طرف نہ اشارہ کیا نہ اس کی توجیح کی۔ یہ انھی کے اجتہادِ فکر کا نتیجہ تھا کہ متحدہ اور مشترکہ قومیت کے نظریہ کے لیے ہمیں، تاریخِ اسلام سے بھی ایک جواز مل سکا اور یہی ان کا ایک اہم نظریاتی کارنامہ ہے۔

□□□

مولانا ابوالکلام آزاد
ایک ہمہ گیر شخصیت

رشید الدین خاں

اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے سوانحی گوشوں پر بہ طور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 684، قیمت: 58.00

حیاتِ جاوید

الطاف حسین حالی

سرسید احمد خاں کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی کے قلم سے سرسید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کا بیان —

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 907، قیمت: 167

مولانا ابوالکلام آزاد
شخصیت، سیاست، پیغام

رشید الدین خاں

مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کا مکمل تعارف —

دوسرا ایڈیشن

صفحات: 336، قیمت: 76.00

سلمان عابد کیریئر گائیڈنس

میٹرک سے ماسٹرس ڈگری تک اسکالرشپ

میٹرک کے بعد ہندستان میں تعلیم کے لیے درج ذیل اسکالرشپیں مہیا ہیں:

نیشنل اسکالرشپ اسکیم:

اس اسکیم کے تحت ہر سال 38000 طلبہ کو اسکالرشپ دی جاتی ہے۔ غریب لیکن قابل اور ذہین طلبہ کو میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے میرٹ کی بنیاد پر دی جانے والی نیشنل اسکالرشپ اسکیم کا آغاز 1961 - 1962 میں ہوا۔ ریاستوں اور مرکزی زیر انتظام علاقوں کی آبادی کے تناسب سے یہ وظیفے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹیوں کے رجسٹرار یا ریاستی محکمہ تعلیمات کے سکریٹری کی جانب سے ہر سال ستمبر کے اواخر تک Maritorous Students کی تفصیلات فراہم کی جانی چاہئیں۔

اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو ہندستان کا شہری ہونا لازم ہے اور اہلیتی امتحان میں 60% نمبروں سے اسی سال پاس ہونا چاہیے جس سال اسکالرشپ کے لیے درخواست دی جارہی ہو۔ وہ طلبہ اسکالرشپ حاصل نہیں کرسکیں گے جو پارٹ ٹائم کورس کررہے ہوں یا پرائیوٹ طور پر پڑھ رہے ہوں یا کسی اسکالرشپ کے حامل ہوں۔ اس اسکیم کے تحت پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز کے لیے اسکالرشپ کی منظوری میں والدین کی سالانہ آمدنی نہیں دیکھی جاتی جبکہ انڈر گریجویٹ اور ڈپلوما کورس کے لیے دی جانے والی اسکالرشپ ایسے ہی طلبہ کے لیے منظور کی جاتی ہے جن کے والدین کی سالانہ آمدنی 25000 کے اندر ہو۔ یہ اسکالرشپ ایک بار منظوری کے بعد طالب علم کے اگلے کورس کے لیے برقرار رہے گی۔ اس اسکالرشپ کے لیے طلبہ کے سلیکشن کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہر کورس کے میرٹ کے حامل طلبہ کی ایک فہرست ریاستی بورڈ یا یونیورسٹی تیار کرکے نتائج کی اجرائی کے دس ہفتوں کے اندر اندر ریاستی حکومت یا مرکزی زیر انتظام علاقوں کے پاس داخل کرتی ہے۔ اسکالرشپ کی منظوری کے بعد یہ کالجیٹ ایجوکیشن یا ہائر ایجوکیشن کے دفتر سے طالب علم کو دی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ اسکالرشپ منظور ہونے کے بعد ہر سال اگلے کورس کے لیے اس اسکالرشپ کی تجدید کی جاتی ہے لیکن شرط یہ ہوگی کہ طالب علم کو 50 فیصد نمبروں سے کامیابی حاصل کرنا ہوگی۔

نمبر	کورس کا نام	غیر اقامتی طلبہ کے لیے ماہانہ رقم	اقامتی طلبہ کے لیے ماہانہ رقم
1۔	پری یونیورسٹی کورس وغیرہ	60	100
2۔	بی اے / بی ایس سی / بی کام / بی آرکیالوجی وغیرہ کورس کے لیے	90	140
3۔	بی ای / بی ٹیک / ایم بی بی ایس / ایل ایل بی / بی ایڈ / ڈپلوما پروفیشنل اور انجینئرنگ اسٹڈیز	120	300
4۔	ڈگری ان ہومیوپیتھک کورس	120	300
5۔	بی ڈی ایس کورس	120	300
6۔	ایم اے / ایم ایس سی / ایل ایل ایم / ایم ایڈ / ایم بی اے	120	300
7۔	پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان ٹورزم	120	300
8۔	ڈپلوما ان ہوٹل مینجمنٹ کورس / ڈپلوما ان ہومیوپیتھی	120	300
9۔	ماسٹر آف لیبر ویلفیر	120	300
10۔	ماسٹر آف سوشل ویلفیر	120	300
11۔	پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان بینکنگ	120	300
12۔	ماسٹر آف کمپیوٹر اپلیکیشن کورس	120	300
13۔	پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان جرنلزم	120	300
14۔	پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلیکیشن	120	300
15۔	پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان کمپیوٹر مینجمنٹ	120	300
16۔	پوسٹ گریجویٹ پروگرام ان مینجمنٹ	120	300
17۔	ماسٹر ان پرسنل مینجمنٹ اینڈ انڈسٹریل ریلیشن	120	120
18۔	پوسٹ گریجویٹ کورس ان آٹوموبائل انجینئرنگ	120	300

مزید تفصیلات کے لیے متعلقہ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات سے ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔

دیہی علاقوں کے ہونہار طلبہ کے لیے سکنڈری ایجوکیشن میں اسکالرشپ:

یہ اسکالرشپ ہر سال 43000 طلبہ میں تقسیم کی جاتی ہے جو دسویں اور بارھویں میں زیر تعلیم ہیں۔ اس کا آغاز دیہی علاقوں میں تعلیمی سہولیات کی کم فراہمی کے پیش نظر 72-1971 میں کیا گیا۔ اس اسکالرشپ کے لیے وہ طلبہ اہل ہیں جو کیمونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے اسکول میں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ اس اسکالرشپ کے حصول کے لیے طلبا کو امتحانات کے دو مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا مرحلہ اس امتحان کا ہوتا ہے جو ریاستی حکومت یا مرکزی زیر انتظام علاقوں کی جانب سے منعقد کیا جاتا ہے۔ اسکالرشپ کے لیے اس مرحلے میں موجود اسکالرشپ کی تعداد سے دس گنا زیادہ تعداد منتخب کی جاتی ہے۔ امتحان کا دوسرا مرحلہ قومی سطح کا ہوتا ہے جسے این. سی. ای. آر. ٹی. منعقد کرتی ہے۔ این. سی. ای. آر. ٹی. کے مرکزی دفتر سے ریاستی یونٹ تال میل کے ساتھ یہ امتحان منعقد کرتے ہیں۔ اس امتحان میں دو پرچے ہوتے ہیں جن میں ہر پرچے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ مختص ہوتا ہے۔ اس طرح سلیکشن کا آخری مرحلہ مکمل ہوتا ہے اور قابل طلبہ کو اسکالرشپ فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے تحت منتخب ہونے والے طلبہ کو ماہانہ 30 سے 100 روپے تک تعلیمی ادارے کے توسط سے ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ اسکالرشپ کورس میں داخلے کے وقت سے لے کر امتحان کے آخری مہینے تک دی جاتی ہے۔ دوسرے سال اس اسکالرشپ کی تجدید اسی ماہ سے ہوتی ہے جس مہینے میں اسکالرشپ منظور کی گئی ہے۔ مگر اسکالرشپ کی تجدید اسی وقت کی جاتی ہے جب طالبِ علم کی تعلیمی ترقی قابلِ لحاظ ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اسکالرشپ منسوخ کردی جاتی ہے۔ اسکالرشپ کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے:

1۔ عام زمرے سے متعلق: ہر کیمونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے لیے چار اسکالرشپ (4 x 5000)
کل = 20,000

2۔ بے زمین مزدوروں کی اولاد کے لیے: ہر کیمونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے لیے دو اسکالرشپ (2 x 5000)
کل = 10,000

3۔ درج فہرست طبقات کے طلبات کے لیے: ہر کیمونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے لیے دو اسکالرشپ اور ہر کیمونٹی ڈیولپمنٹ بلاک میں موجود 20% یا اس سے زیادہ درج فہرست طبقات کی آبادی کے لیے ایک اضافہ اسکالرشپ
(1x 1500) .(2x5000)
کل = 11,500

4۔ درج فہرست قبائل کے طلبہ کے لیے: ہر ٹرائبل کیمونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے لیے تین اسکالرشپ (3x500)

مزید تفصیلات کے لیے اپنی ریاست کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکول یا ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن سے ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔

غیر ہندی ریاستوں کے ہندی پڑھنے والے طلبہ کے لیے اسکالرشپ:

غیر ہندی ریاستوں سے تعلق رکھنے والے ایسے طلبہ کے لیے جو دسویں کے بعد سے ہندی پڑھ رہے ہوں، دو ہزار پانچ سو طلبہ کے لیے وظیفے دیے جاتے ہیں۔ پی یو سی / انٹر میڈیٹ / انڈر گریجویٹ / ایم اے / پری پی ایچ ڈی / ایم لٹ یا پی ایچ ڈی (ہندی کے ساتھ) تک یہ وظیفے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے کا اعلانیہ جون یا جولائی میں جاری کیا جاتا ہے۔ اس اسکالرشپ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ غیر ہندی ریاستوں میں ہندی پڑھنے والے طلبہ کی ہمت افزائی ہو۔ اس اسکالرشپ کا آغاز قومی سطح پر 85-1984 میں ہوا۔ ریاستی حکومتیں اخبارات میں اعلانیے کی اجرائی کے ذریعے اسکالرشپ کے لیے درخواستیں طلب کرتی ہیں۔ یہ وظیفے درج ذیل تعلیمی پروگراموں کے لیے دیے جاتے ہیں۔

(الف) پری یونیورسٹی / انٹرمیڈیٹ یا اس کے مماثل امتحان جو میٹریکولیشن SSLC یا اس کے مماثل امتحان کی بنیاد پر ہو۔

(ب) فرسٹ ڈگری کورس جو پی یو سی امتحان کی بنیاد پر یا ہائر سیکنڈری امتحان کے بعد کیے جاتے ہیں۔

(ج) ایم اے (ہندی) جو بی اے، بی ایس سی یا بی کام یا اس کے مماثل امتحان کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

(د) پری پی ایچ ڈی / ایم لٹ (ہندی) جو ایم. اے. ہندی یا اس کے مماثل امتحان کے بعد کیا جاتا ہے۔

(ح) پی ایچ ڈی (ہندی)

(و) ایسے ہمہ وقتی کورس جنھیں ہندی کی رضاکارانہ تنظیمیں منعقد کرتی ہیں اور جنھیں یونیورسٹی یا تعلیمی بورڈ انٹرمیڈیٹ کے مماثل درجہ دیتے ہیں۔

ان وظیفوں کے لیے ایسے طلبہ اہل ہیں جن کی مادری زبان ہندی نہ ہو اور جن کا تعلق ان ریاستوں سے ہو: آندھرا پردیش، آسام، گجرات، جموں اور کشمیر، کرناٹک، کیرل، مہاراشٹر، منی پور، میگھالیہ، ناگالینڈ، اڑیسہ، پنجاب، سکم، تامل ناڈو، تری پورہ، ویسٹ بنگال، انڈمان اینڈ نکوبار جزائر، اروناچل پردیش، چنڈی گڑھ، دادر، گوا، دمن اینڈ دیپ، لکشدیپ، میزورم اور پانڈی چیری۔

اسکالر شپ میرٹ کی بنیاد پر انھی طلبہ کو دی جاتی ہے جو بورڈ، یونیورسٹی، رضاکارانہ ہندی تنظیم کی جانب سے منعقدہ امتحان پہلی ہی بار میں کامیاب کر چکے ہوں۔ درج ذیل زمروں سے تعلق رکھنے والے طلبہ اس اسکالر شپ کے اہل نہیں ہوں گے۔

(الف) ایسے طلبہ جن کا تعلق غیر ہندی ریاستوں سے ہے مگر ہندی ریاستوں میں گزشتہ پانچ برسوں سے رہتے ہوں۔

(ب) برسر خدمت افراد

(ج) ایسے طلبہ جو اپنی تعلیم فاصلاتی طرز سے حاصل کر رہے ہوں۔

(د) ایسے طلبہ جو بیک وقت دو کورس کر رہے ہوں۔

یہ اسکالر شپ حاصل کرنے والے طلبہ اس اصول کے پابند نہیں ہوں گے کہ یہ دوسری کوئی اسکالر شپ حاصل نہ کریں۔ چونکہ یہ اسکالر شپ ہندی سیکھنے کے لیے ایک ترغیب کے طور پر دی جاتی ہے اس لیے اس کے ساتھ کسی دوسری اسکالر شپ کے حصول کی ممانعت نہیں رکھی گئی۔

کورس کے مطابق ہندی اور غیر ہندی ریاستوں کے طلبہ میں اسکالر شپ کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے۔

کورس کا نام	غیر ہندی ریاستوں میں (ماہانہ روپے)	ہندی ریاستوں میں (ماہانہ روپے)
پری یونیورسٹی، انٹرمیڈیٹ، ڈگری کا پہلا سال اور اس کے مماثل کورس	50روپے	80روپے
بی اے دوسرا اور تیسرا سال	75روپے	105روپے
ایم اے/ایم لٹ اور اس کے مماثل کورس اور ہندی ٹیچر ٹریننگ کورس	100روپے	125روپے
پی ایچ ڈی	100روپے	125روپے

اس اسکالر شپ کے لیے غیر ہندی ریاستوں کی حکومتوں کی جانب سے انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔ انتخاب کی بنیاد طلبہ کے اہلیتی امتحان میں حاصلہ نمبروں کے فیصد پر منحصر ہوگی۔ ایسے طلبہ کو ترجیح دی جاتی ہے جنھیں حکومتوں کی جانب سے اسپانسر کیا گیا ہو یا جو برسر خدمت ہوں۔ طالب علم کی تعلیمی ترقی اور پابند حاضری کے مطابق سال بہ سال اس اسکالر شپ کی تجدید عمل میں آتی ہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے اسکالر شپ کی مدت دو یا تین سال رکھی جاتی ہے۔

ان اسکالر شپ کے لیے درخواست فارم غیر ہندی ریاستی حکومتیں فراہم کرتی ہیں۔ رضاکارانہ ہندی تنظیمیں اپنی درخواستیں ریاستی حکومتوں کے پاس پیش کرتی ہیں۔

مزید تفصیلات کے لیے ریاستی حکومت یا مرکزی زیر انتظام علاقوں کی حکومتوں یا ڈائرکٹر آف ایجوکیشن سے ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔

میڈیکل گریجویٹ کے لیے اسکریننگ ٹیسٹ:

حکومت ہند نے ایسے تمام میڈیکل گریجویٹس کے لیے ایک اسکریننگ ٹیسٹ میں کامیابی کو لازمی قرار دیا ہے جنھوں نے بیرون ہند سے میڈیکل تعلیم مکمل کی ہو اور ہندستان میں پریکٹس کرنا چاہتے ہوں۔ یہ ٹیسٹ نیشنل بورڈ آف ایگزامینیشن نئی دہلی (NBE) منعقد کرتا ہے۔ یہ ٹیسٹ سال میں دو مرتبہ (این بی ای) کی جانب سے مقررہ شیڈول کے مطابق منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ امتحان Pre-Clinical, Para- Clinical اور Clinical Medicine اور اس کے الائیڈ موضوعات پر مشتمل Multiple Choice سوالات کی صورت میں تین پرچوں پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر پرچے کے لیے تین گھنٹوں کا وقت دیا جاتا ہے جبکہ پرچے کی زبان انگریزی ہوتی ہے۔ کامیابی کے لیے ہر پرچے میں 50% نمبر حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہر طالب علم کو اس اسکریننگ ٹیسٹ کو کامیاب کرنے کے لیے تین مواقع دیے جاتے ہیں۔ اگر وہ تین مواقع میں بھی امتحان کامیاب نہ کرسکے تو ایسے میڈیکل گریجویٹ کو میڈیکل کونسل آف انڈیا کا رجسٹریشن نہیں دیا جائے گا۔ مزید تفصیلات کے لیے ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ہندستان سے باہر میڈیکل کورس میں داخلے کے خواہشمند مزید اور مکمل Guidelines اس پتے پر حاصل کرسکتے ہیں۔

Secretary, Medical Council of India (MCI)
Aiwan-e-Ghalib Marg,
Kotla Road, New Delhi - 110002

سائنسی مضامین کے طلبہ کے لیے دسویں سے پی ایچ ڈی تک اسکالرشپ:

حکومت ہند کے ڈپارٹمنٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی کی جانب سے ہر سال شاندار اسکالرشپ طلبہ کو دیے جاتے ہیں۔ اس اسکالرشپ کو کے. پی. وائی. اسکالرشپ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے حصول کے لیے درج ذیل طلبہ اہل ہیں:

(1) ایسے طلبہ جنھوں نے دسویں جماعت پاس کی ہو اور سائنسی مضامین میں 75% نمبر حاصل کیے ہوں اور جنھوں نے انٹرمیڈیٹ سال اول میں داخلہ حاصل کیا ہو۔

(2) گریجویشن کر رہے طلبہ جنھوں نے بارھویں جماعت میں سائنسی مضامین میں 75% نمبر حاصل کیے ہوں اور جو بی. ایس. سی. یا انٹی گریٹڈ ایم ایس سی میں داخلہ حاصل کر چکے ہوں۔

(3) گریجویشن کے سال دوم کے طلبہ جنھوں نے بارھویں جماعت میں سائنسی مضامین میں 75% نمبر حاصل کیے ہوں اور بی ایس سی یا انٹی گریٹڈ ایم ایس سی کا سال اول مکمل کر چکے ہوں۔

پہلی اسکالرشپ کے لیے منتخب 120 طلبہ کو ماہانہ 2000 روپے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل تک دیے جائیں گے۔ ساتھ میں سالانہ 4000 اتفاقی گرانٹ بھی رہے گی۔ دوسری صورت میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل تک ماہانہ 3000 روپے اور سالانہ 6000 روپے اتفاقی گرانٹ منظور کی جاتی ہے۔

(4) انجینیرنگ کے ایسے طلبہ جنھوں نے بی ای / بی ٹیک / بی آرک کے سال اول میں داخلہ حاصل کیا ہو اور جنھوں نے بارھویں جماعت میں سائنسی مضامین میں 75% نمبر حاصل کیے ہوں۔ ان کے لیے ماہانہ 3000 روپے اور سالانہ 6000 روپے اعلیٰ تعلیم تک اتفاقی گرانٹ دی جاتی ہے۔ اتنی ہی رقم پر مشتمل اسکالرشپ ان طلبہ کے لیے بھی دی جاتی ہے جو انجینیرنگ یا آرکیٹکچر کا سال اول مکمل کر چکے ہوں اور سال دوم میں ہوں۔

(5) میڈیسن کے ایسے طلبہ جنھوں نے ایم بی بی ایس کا پہلا امتحان پاس کر لیا ہے اور ایم بی بی ایس میں انھیں داخلہ مل چکا ہے، اور جنھوں نے بارھویں جماعت میں سائنسی مضامین میں 75% نمبر سے کامیابی حاصل کی ہوں۔ ایسے طلبہ کے لیے ماہانہ 3000 روپے اور سالانہ 6000 روپے اتفاقی گرانٹ منظور کی جاتی ہے۔ درخواست فارموں کی جانچ کے بعد جملہ 1000 طلبہ کو تحریری امتحان میں شرکت کی اجازت دی جاتی ہے۔ امتحان میں کامیاب صرف 500 طلبہ ہی کو فائنل انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے۔

درخواست فارم حاصل کرنے کے لیے بنگلور میں قابل ادا 75 روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ SID A/c. KVPY روانہ کرنا چاہیے۔ ساتھ میں خود کا پتا لکھے دو لفافے بھی منسلک ہوں۔ اس کے ساتھ ایک گزارش نامہ جس میں نام پتا اور کس زمرے کی اسکالرشپ کے لیے فارم طلب کیا جا رہا ہو اس کی صراحت ہونی چاہیے۔ خانہ پری کے بعد درخواستیں داخل کرنے کی آخری تاریخ 3 جون 2002 مقرر ہے۔

پتا:

The Convenor,
Kishore Vagyanic Protsahan Yojna,
Indian Institute of Science,
Bangalore - 560012

راشٹریہ انڈین ملٹری کالج میں داخلے:

تعلیم اہم ہو اور اہم ادارے سے تعلیم حاصل کی گئی ہو تو طالب علم کا کیریر شاندار ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک ادارہ راشٹریہ انڈین ملٹری کالج (RIMC) ہے جو دہرادون میں واقع ہے۔ اس کی آٹھویں جماعت میں داخلے جاری ہیں جس کے لیے طالب علم کو جنوری 2003 تک ساتویں جماعت پاس کر چکا ہو اور اس کی عمر 11 سال ہو۔ تحریری امتحان کی بنیاد پر داخلہ کیا جاتا ہے۔ یہ امتحان انگریزی، ریاضی اور جنرل نالج کے پرچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ریاضی کا پرچہ ہندی یا انگریزی میں لکھا جاتا ہے جبکہ جنرل نالج کا پرچہ ہندی یا انگریزی کے علاوہ کسی بھی ہندستانی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ تحریری امتحان میں کامیابی کے بعد ریاستی حکومتیں اپنے طور پر انٹرویوز منعقد کرتی ہیں۔

درخواست فارم حاصل کرنے کے لیے کمانڈنٹ آر آئی ایم سی دہرادون کے نام پر 175 روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ روانہ کرنا ہوگا۔

پتا:

Commandant,
Rashtriya Indian Military College,
Dehradun (Uttranchal)

☆☆☆

161, SPL C, CIB Quarters
Nehru Nagar, Kachiguda
Hyderabad - 27 (A.P.)

عبدالنور شبلی

صحافت میں کیریئر

زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے کوئی ضروری نہیں کہ آپ کے پاس انجینئرنگ، میڈیکل یا پھر مینجمنٹ کی ڈگریاں ہوں۔ بدلتے ہوئے حالات میں اب بہت سے کورسیز ایسے ہیں جنھیں کرنے کے بعد اچھے سے اچھا کیریئر بنایا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی کچھ کورسیز میں سے ایک ہے صحافت۔ کچھ سال پہلے تک لوگوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ صحافی کا مطلب ہوتا ہے ہوائی چپل پہنے ہوئے اور ہاتھ میں جھولا لٹکائے ہوئے تکلیف اور پریشانی میں مبتلا شخص! کچھ سال پہلے تک صحافیوں کی اتنی تنخواہ نہیں تھی کہ وہ آرام کی زندگی گزار سکیں۔ گھر کے لیے ضروریات کا سامان خریدنا بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا تھا، مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ صحافت اب ایسا کیریئر تصور کیا جانے لگا ہے جس میں پیسے بھی بہت ہیں اور شہرت بھی۔ موجودہ دور میں بہت سے صحافی ایسے بھی ہیں جن کو ایک مضمون کے لیے اتنے پیسے ملتے ہیں جتنی ایک انجینئر کی ماہانہ تنخواہ بھی نہیں ہوتی۔ اب صحافت گلیمر اور شہرت سے بھرا کیریئر ہے۔ پہلے کچھ ہی یونی ورسٹیاں ایسی تھیں جہاں صحافت کی تعلیم دی جاتی تھی، مگر اب ہندستان میں لگ بھگ سبھی یونی ورسٹیوں میں صحافت کا کورس موجود ہے۔ ان میں جو یونی ورسٹیاں مشہور ہیں ان کے نام ہیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، بنارس ہندو یونی ورسٹی، دلی یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کاشی ودیاپیٹھ، جادوپور یونی ورسٹی، پنجاب یونی ورسٹی، پوروانچل یونی ورسٹی، آگرہ یونی ورسٹی، لکھنؤ یونی ورسٹی اور ناگپور یونی ورسٹی۔ مندرجہ بالا یونی ورسٹیوں میں صحافت کی تعلیم انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر دی جاتی ہے۔ صحافت کے کورس میں داخلہ لینا کوئی مشکل کام نہیں، آپ جہاں چاہیں داخلہ لے سکتے ہیں مگر اس فیلڈ میں کامیابی کے لیے صرف کورس مکمل کرنا کافی نہیں ہے۔ سب سے ضروری ہے کہ آپ اس زبان میں مہارت رکھتے ہوں جس میں اپنا مضمون لکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اس موضوع میں آپ کی دلچسپی بھی ہو۔ اگر آپ کو اس میدان میں دلچسپی ہے، لکھنے کی صلاحیت ہے تو آپ کو آسانی سے کسی اخبار میں نوکری مل سکتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ صحافی بننے کے لیے صحافت کا کورس کیا جائے۔ ہندستان میں بہت سے ایسے صحافی گزرے ہیں جنھوں نے صحافت کی دنیا میں کافی نام کمایا مگر انھوں نے صحافت کا کوئی کورس نہیں کیا تھا۔ اب بھی بہت سے صحافی ایسے ہیں جن کی ہندستان میں الگ پہچان ہے مگر انھوں نے کہیں سے کوئی کورس نہیں کیا ہے، ان کے اپنے لکھنے کی صلاحیت اور اس میدان میں دلچسپی نے ان کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔

دلی میں بی بی سی کے نامہ نگار قربان علی سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ دو تین سال پہلے انھوں نے جماعتِ اسلامی ہند کے مرکزی دفتر میں ایک پروگرام کے دوران کچھ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں نے صحافت کا کہیں سے کوئی کورس نہیں کیا ہے۔ صحافت کا کورس پاس کر لینے سے آپ ایک اچھے صحافی نہیں بن سکتے، اس میدان میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس میں پوری دلچسپی لیں اور مختلف حالات و واقعات سے پوری طرح باخبر رہیں، زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں تبھی اس میدان میں شہرت حاصل کر سکتے ہیں۔" مختلف یونی ورسٹیوں کے علاوہ بہت سارے دوسرے ادارے بھی صحافت کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان میں جو ادارے مشہور ہیں ان میں ایشین کالج آف جرنلزم (Asian College of Journalism) بنگلور، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن، دلی اور ٹائمز اسکول آف جرنلزم، نئی دہلی ہیں۔ مندرجہ بالا تینوں اداروں کا ہندستان میں اپنا ایک الگ مقام ہے۔ ایشین کالج آف جرنلزم کا قیام 1994 میں انڈین ایکسپریس گروپ کے ذریعے ہوا۔ حالانکہ اس کالج کا کسی یونی ورسٹی سے الحاق نہیں ہے پھر بھی یہ ادارہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں نو ماہ کا پوسٹ گریجویٹ کورس ہوتا ہے، سیٹوں کی تعداد تیس ہے اور فیس 15000 روپے ہے۔ اس میں داخلہ لینے کے لیے امیدواروں کو ٹیسٹ دینا پڑتا ہے، ٹیسٹ کے زیادہ تر سوالات عام معلومات سے متعلق ہوتے ہیں۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کو ہندستان میں صحافت کے لیے سب سے بہتر ادارہ مانا جاتا ہے۔ یہ نئی دہلی میں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کیمپس میں واقع ہے۔ اس کا قیام 1965 میں عمل میں آیا تھا۔ یہاں ہندی اور انگریزی دونوں میں کورس موجود ہے جس کی فیس 2000 روپے ہے۔ ہندی اور انگریزی میں 40-40 نشستیں ہیں، اس انسٹی ٹیوٹ میں داخلے کے لیے پورے ہندستان میں ایک ساتھ داخلہ ٹیسٹ ہوتا ہے، تحریری ٹیسٹ میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو انٹرویو سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس ادارے میں صحافت کے تعلق سے جتنی سہولتیں موجود ہیں اتنی ہندستان کے اور

کسی دوسرے ادارے میں نہیں ہیں۔ یہاں صحافت کے تعلق سے ہندستان کی سب سے بڑی لائبریری بھی موجود ہے۔ ٹائمز اسکول آف جرنلزم، ٹائمز آف انڈیا گروپ نے 1985 میں قائم کیا ہے۔ یہاں نو مہینے کے کورس میں داخلے کے لیے امیدوار کو کل ہند سطح کے تحریری ٹیسٹ اور پھر انٹرویو سے گزرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی امیدوار جس نے 50 فی صد مارکس کے ساتھ گریجویشن کیا ہو، اس داخلہ ٹیسٹ میں شریک ہوسکتا ہے۔ کورس فیس 35000 ہے۔ صحافت کے کورس کے لیے اتنی زیادہ فیس ہندستان میں اور کہیں نہیں ہے۔ یہاں سے کورس کرنے کے بعد سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں ٹائمز آف انڈیا گروپ کے جو بھی اخبارات یا رسائل ہیں ان میں نوکری آسانی سے مل جاتی ہے۔ پرائیویٹ اداروں میں بھارتی ودیا بھون کا نام بھی کافی مشہور ہے، اس کے سینٹر ہندستان کے بہت سارے شہروں میں موجود ہیں جن میں خاص ہیں دلی، احمد آباد، ممبئی حیدرآباد اور کیرالا۔ نئی دہلی میں بھارتی ودیا بھون کستوربا گاندھی مارگ پر واقع ہے۔ داخلے کے لیے امیدوار کا گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ داخلے کے لیے پہلے انگریزی کا ٹیسٹ ہوتا ہے اور کامیاب ہونے والے امیدوار کو انٹرویو کے بعد داخلہ ملتا ہے۔ اس ادارے کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں کلاسس شام میں ہوتی ہیں۔ یہ کورس ایسے لوگوں کے لیے کافی فائدہ مند ہے جو میڈیا سے متعلق کوئی کام کررہے ہیں۔ ہندستان میں بہت سے ادارے ایسے بھی ہیں جہاں سے صحافت کی تعلیم، فاصلاتی تعلیمی نظام کے تحت دی جاتی ہے۔ ایسے اداروں میں سب سے پہلا نام اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی کا ہے۔ یہاں صحافت کا کورس ''پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن'' کے نام سے موجود ہے۔ اس میں داخلے کے لیے امیدوار کو گریجویٹ ہونے کے ساتھ ساتھ میڈیا کے میدان میں کم سے کم دو سال کا تجربہ ضروری ہے۔ ویسے تو یہاں کا کورس مکمل کرنے کی چھوٹ موجود ہے۔ یہ کورس بھی ان لوگوں کے لیے کافی فائدہ مند ہے جو پہلے سے کسی اخبار، رسالے یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے منسلک ہیں۔ امتحان سے کچھ پہلے Contact Classes کا اہتمام کیا جاتا ہے جہاں اس میدان کے کافی تجربہ کار لوگ کلاسیں لیتے ہیں۔ صحافت کا کورس کرنے کے بعد نوکری کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر آپ میں صلاحیت ہے تو کسی بھی اخبار یا رسالے میں آسانی سے نوکری مل سکتی ہے۔ تنخواہ بھی اچھی ہوتی ہے۔ اگر آپ ہندی یا انگریزی کے کسی اچھے اخبار میں جاتے ہیں تو آپ کی شروعاتی تنخواہ پانچ ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ اگر آپ کسی اخبار کو جوائن نہیں کرنا چاہتے تو آزادانہ طور پر بھی لکھ سکتے ہیں۔ ایسا کرنے والوں کو آزاد صحافی (Freelance Journalist) کہتے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا، ہندستان ٹائمز انڈین ایکسپریس، پائنیر، دی ہندو، ایشین ایج اور ہندی کے دینک جاگرن، جن ستہ اور راجستھان پتریکا ایسے اخبارات ہیں جو آزاد صحافی کو کافی پیسے دیتے ہیں۔

صحافت کی تعلیم دینے والی یونی ورسٹیاں اور کورسس:

- علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ / ڈپلوما، ماس کمیونیکیشن۔
- پنجاب یونی ورسٹی، پٹیالہ / ماس کمیونیکیشن میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن۔
- کلکتہ یونی ورسٹی، کلکتہ / ایم۔اے۔
- جبل پور یونی ورسٹی / بیچلر آف جرنلزم اینڈ کمیونیکیشن۔
- روی شنکر یونی ورسٹی، رائے پور / بیچلر آف جرنلزم۔
- مدراس یونی ورسٹی، مدراس / بیچلر ڈگری۔
- میسور یونی ورسٹی، میسور / بیچلر ڈگری۔
- ناگپور یونی ورسٹی، ناگپور / بیچلر ڈگری۔
- شیواجی یونی ورسٹی، کولہاپور / بیچلر آف جرنلزم اینڈ کمیونیکیشن۔
- کالی کٹ یونی ورسٹی، کالی کٹ / ایم۔اے۔
- مراٹھواڑا یونی ورسٹی، اورنگ آباد / بیچلر ڈگری۔
- پونہ یونی ورسٹی، پونہ / بیچلر آف کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم
- بی۔ایچ۔یو۔ بنارس / بی۔اے، ایم۔اے۔
- راجستھان یونی ورسٹی، جے پور / ڈپلوما ان جرنلزم۔
- گوہاٹی یونی ورسٹی، آسام / ڈپلوما ان جرنلزم۔
- سوراشٹر یونی ورسٹی، راج کوٹ / ماس کمیونیکیشن میں بیچلر اور ماسٹر ڈگری۔
- بنگلور یونی ورسٹی، بنگلور / بیچلر آف سائنس ان کمیونیکیشن۔
- پنجاب یونی ورسٹی، چنڈی گڑھ / بیچلر اینڈ ماسٹر آف ماس کمیونیکیشن۔
- آگرہ یونی ورسٹی، آگرہ / ڈپلوما ان ماس میڈیا۔
- کاشی ودیا پیٹھ، بنارس / بیچلر آف جرنلزم۔
- لکھنؤ یونی ورسٹی، لکھنؤ / ایم۔اے ان جرنلزم۔
- گڑھوال یونی ورسٹی / ڈپلوما ان جرنلزم۔
- پوروانچل یونی ورسٹی، جونپور / ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن۔
- جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی / اردو میں ڈپلوما ان ماس کمیونیکیشن۔
- جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی / ایم۔اے ان ماس کمیونیکیشن۔
- دلی یونی ورسٹی، دلی / بیچلر ڈگری ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن۔

(بہ شکریہ منصف، حیدرآباد)

عظیم صدیقی

مائکروسافٹ ورڈ

اپنی فائل کھولنا (Opening Your File)

- فرض کیجیے آپ نے اپنی فائل کا نام fox jumps رکھا ہے۔ آپ اپنی فائل کو کئی طریقوں سے کھول سکتے ہیں۔
- لوح آلات پر File کلک کریں۔ اس فہرست میں سب سے آخر میں آپ کی فائل کا نام Fox Jumps لکھا ہے۔ اس پر کلک کیجیے۔ فائل کھل جائے گی۔
- اگر فائل وہاں نہیں ہے تو ان تینوں میں سے کوئی ایک عمل کریں۔
- فائل کی فہرست (Menu) میں Open پر کلک کریں۔ یا
- تختہ کلید پر Crtl+O کو ایک ساتھ دبائیں۔ یا
- لوح آلات پر پیکان لے جا کر اس علامت پر کلک کریں۔

اس سے مندرجہ ذیل استفساریہ نکل کر آئے گا۔

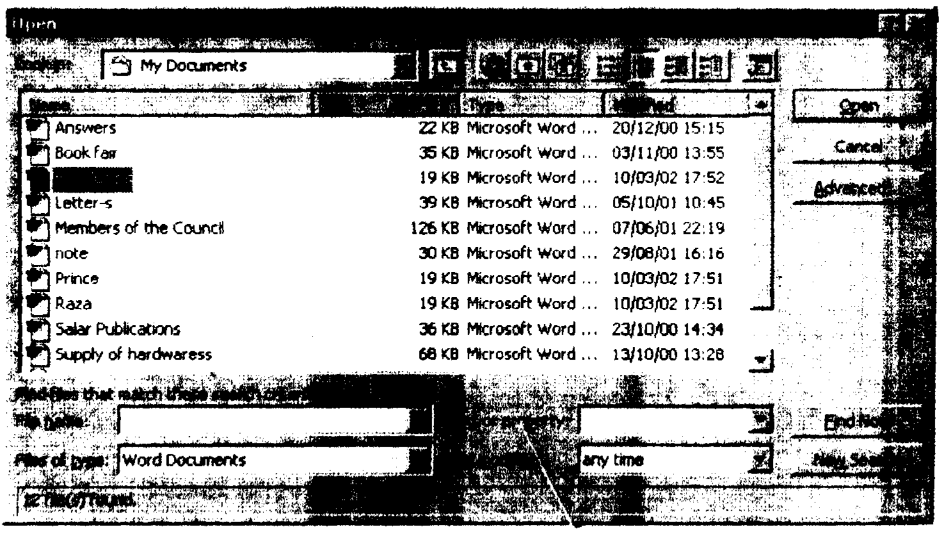

- اس وقت استفسار یے میں My Document نامی بستہ کھلا ہوا ہے۔ اس میں فائل کا نام Fox Jumps بھی لکھا ہے۔
- Fox Jumps کلک کیجیے یا Fox Jumps ٹائپ کریں۔ اب Open پر کلک کریں۔ فائل کھل جائے گی۔
- اگر فائل دوسرے بستے میں ہے تو اس بستے کو پہلے کھولنا ہوگا۔ فرض کیجیے اس بستے کا نام Brown Fox ہے۔ اس کو کھولنے کے لیے اس کی علامت پر کیجیے۔ بستوں کی فہرست نمودار ہوگی۔ اس میں Brown Fox بستے پر کلک کر کے Open پر کلک کیجیے۔ بستہ کھل جائے گا۔ اس میں آپ کی فائل کا نام Fox Jumps لکھا ہوگا۔
- اس پر کلک کر کے Open پر کلک کریں۔ فائل کھل جائے گی۔

نئی فائل کھولنا (Opening a New File)

- یوں تو کوئی کلید (Software) جب کھلتا ہے تو اس میں ایک بے نامی (untitled) فائل کھلی ہوتی ہے۔ جیسے یہاں (Doc-1) کھلی ہے جس میں کام کر کے اس کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اگر کام کرتے کرتے نئی فائل کھولنے کی ضرورت پڑ جائے تو ان میں سے کوئی ایک عمل کریں۔
- فائل (File) کی فہرست میں جا کر New پر کلک کریں۔ یا
- لوح آلات (Tool Bar) پر پیکان لے جا کر اس علامت پر کلک کریں۔ یا

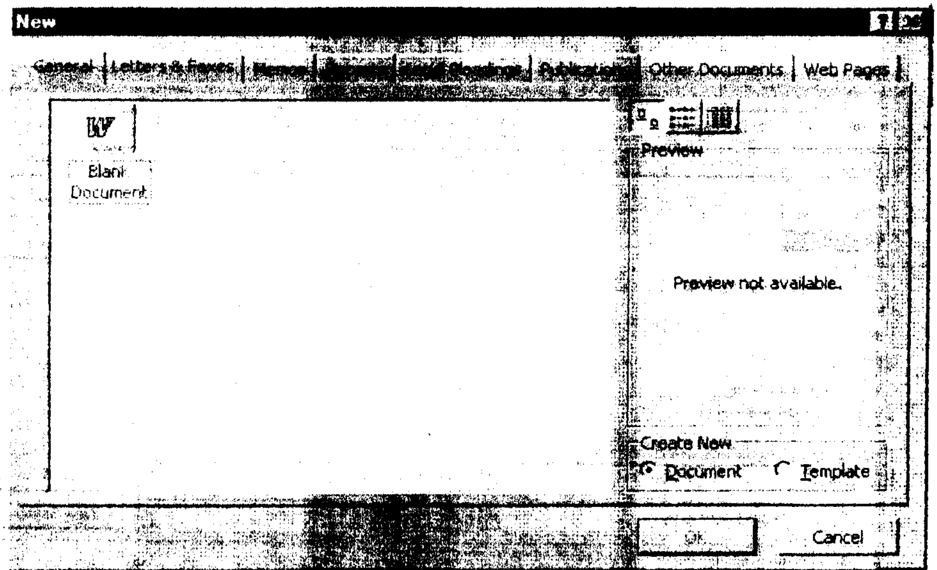

- تختہ حجی پر Ctrl + N ایک ساتھ دبائیں تو بھی یہی استفساریہ (Dialogue Box) نکل آئے گا۔

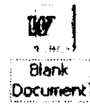

- اس علامت پر کلک کیجیے۔ یہ اپنا رنگ تبدیل کرلے گی۔ اب نیچے پیکان لے جاکر (Document) کی بندی میں کلک کریں۔ گولے میں کالا تل نمایاں ہونے پر OK کلک کریں۔ دریچے میں ایک نئی فائل کھل جائے گی۔

- مختلف قسم کی دستاویز جیسے Legal Proceedings, Letters & Faxes, Memos وغیرہ کے نمونے ان پر کلک کرکے Preview کی بندی میں کلک کر کے دیکھے جاسکتے ہیں۔ جس نمونے پر آپ کلک کریں گے آپ کی دستاویز اسی نمونے کی بنیاد پر ٹائپ ہو جائے گی۔

- پیش منظر (Preview) کے اوپر بنے تین خانوں میں بیچ کے خانے پر کلک کرکے ان کی فہرست دیکھی جاسکتی ہے جس میں سے استعمال کے مطابق ان میں سے کوئی ایک منتخب کیا جاسکتا ہے۔ اس کا پیش منظر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

دستاویز پر قبل طباعت ایک نظر (Printer's Preview)

امید ہے اب تک آپ نے اپنی دستاویز کا املا اور ہجے درست کر لیے ہوں گیں۔ اب آپ اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ یہ دستاویز چھپنے کے بعد کیسی دکھائی دے گی تو ان میں سے کوئی ایک عمل کریں۔

- لوح آلات پر اس علامت پر کلک کریں۔ یا
- تختۂ کلید پر Alt + Ctrl + P ایک ساتھ دبائیں۔ یا
- File کی فہرست میں جاکر Printers Preview پر کلک کریں۔

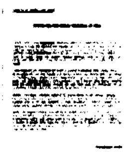

فوراً ہی دستاویز دریچے میں مکمل انداز طبع میں وارد ہوگی۔ پیکان کو اس پر لاکر کلک کرنے پر یہ دو گنی سے بڑی ہو جائے گی جس سے اس کی غلطیاں دیکھی جاسکیں گی۔ دوبارہ کلک کرنے پر دستاویز واپس پرانی حالت میں چلی جائے گی۔ اگر کوئی غلطی درست کرنی ہو تو

- اس کی لوح آلات پر Close پر کلک کریں۔
- اور پھر View کی فہرست میں جاکر پہلے Normal پر کلک کریں، پھر غلطیاں درست کریں۔

دستاویز کے حاشیوں میں تبدیلی (Change in Margins)

- اگر آپ سمجھتے ہیں کہ دستاویز کے حاشیوں میں کچھ تبدیلیاں لازم ہیں تو

- File پر کلک کر کے اس کی فہرست میں Page Setup پر کلک کریں۔ یہ استفساریہ نکل آئے گا۔
- حاشیوں کی تبدیلی اس میں ہندسوں کی جگہ دوسرے ہندسے ٹائپ کر کے کی جاسکتی ہے۔ یا
- حاشیہ بڑھانے کے لیے اوپر کے پیکانی نشان پر کلک کریں اور کم کرنے کے لیے نیچے کے پیکانی نشان پر کلک کریں۔ یہ حاشیوں کی تبدیلی اوپر، نیچے، دائیں اور بائیں چاروں اطراف میں کر سکتے ہیں۔
- مستقل تبدیلی کے لیے Default پر کلک کریں۔
- دونوں طرف یکساں حاشیوں کے لیے Mirror Margin پر کلک کریں۔

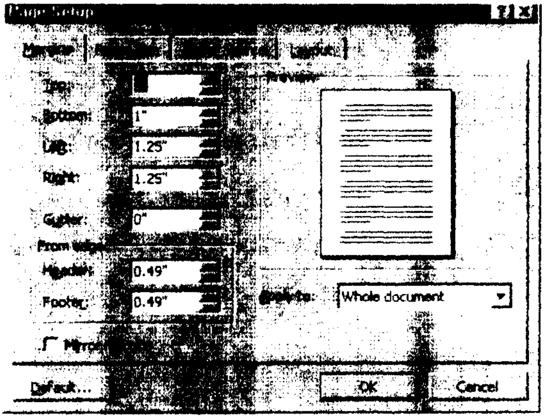

- تبدیلیوں سے جب مطمئن ہو جائیں تو OK پر کلک کریں۔ مجوزہ حاشیے قائم ہو جائیں گے۔

دستاویز کا چوکھٹا بدلنا (Change in Margin)

- فی الحال آپ کی یہ دستاویز کھڑے چوکھٹے (Portrait) میں ہے اور اس کا سائز "11 x "8.5 ہے۔ یہ سائز بدلا جاسکتا ہے۔

اس کے لیے Page Setup کے استفساریے میں Paper Size پر کلک کریں۔ استفساریہ میں تبدیلی آجائے گی۔ Letter کے پیکان پر کلک کرنے سے کئی سائز نمایاں ہوں گے۔

آپ جس سائز پر کلک کریں گے اس کا ناپ (Width/ Length) کے خانوں میں آجائے گا۔

صرف اسی دستاویز پر یہ سائز نافذ کرنے کے لیے Apply to whole document پر کلک کریں۔

تمام آئندہ دستاویزوں میں یہ سائز قائم رکھنے کے لیے Default پر کلک کریں۔

کھڑے چوکھٹے کی جگہ پڑے چوکھٹے کے لیے Landscape پر کلک کریں۔ یہ سب آپ کو پیش منظر میں دکھائی دے گا۔

سب طرف سے مطمئن ہونے کے بعد OK پر کلک کریں۔ مجوزہ سائز دستاویز پر نافذ ہو جائے گا۔

دستاویز کی طباعت کرنا (Printing the Document)

- جب آپ دستاویز کو غلطیوں سے پاک کرلیں، سائز و حاشیوں سے مطمئن ہو جائیں تو اس کی طباعت کی جا سکتی ہے۔
- File پر کلک کریں اور اس کی فہرست میں جا کر Print پر کلک کریں۔ یا
- لوحِ آلات پر اس علامت پر کلک کریں۔ دستاویز طبع ہو جائے گی۔
- اگر مطبع Printer کا استفسار یہ نکلے تو اس کو مناسب طریقے سے پُر کریں۔

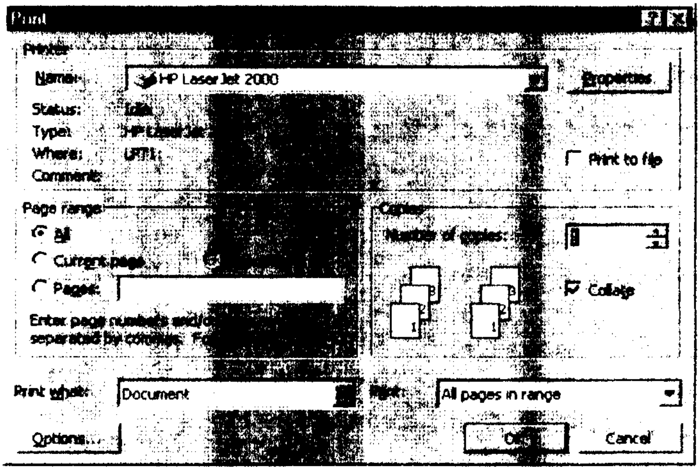

- یوں تو اس میں کئی متبادلات ہیں لیکن فی الحال آپ سلسلۂ صفحات (Page range) میں یہ تعین کریں کہ تمام صفحات یا صرف یہی ایک صفحہ (Current Page) طبع کرنا ہے۔
- یہ بھی تعین کریں کہ کتنی نقول (No. of Copies) اس وقت طبع کرنی ہیں۔ یہ اس کے خانے میں ٹائپ کریں۔
- Properties پر کلک کر کے کھڑے یا پڑے چوکھٹے (Portrait/ Landscape) کا بھی تعین کرلیں۔
- ان تمام امور سے مطمئن ہو کر OK پر کلک کریں یا Enter دبائیں۔ دستاویز طبع ہو جائے گی۔

(جاری)

ملک راشد فیصل

کوئز

قبائل

(1) ہندستان میں سب سے بڑا قبیلہ کون سا ہے؟
(الف) گونڈ (ب) بھیل
(ج) بھوت (د) ناگا

(2) کس قبائلی گروہ میں مادرانہ سوسائٹی کارواج ہے؟
(الف) کوکی (ب) توڈا
(ج) اونجی (د) کھاسی

(3) ہندستان میں ایک ایسا قبیلہ ہے جس کے لوگ پہاڑی کی چوٹی پر اپنے گھر بناتے ہیں۔ اس قبیلے کا نام بتائیں۔
(الف) ابور (ب) میری
(ج) ناگا (د) اُپاتنی

(4) سینٹنلیز کہاں کے باشندے ہیں؟
(الف) لکشدیپ (ب) انڈمان ونکوبار
(ج) تمل ناڈو (د) کیرالا

(5) اسکیمو کے برف سے بنے گھر کو کیا کہا جاتا ہے؟
(الف) یورٹ (ب) اگلو
(ج) کایک (د) ٹوپک

(6) آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کو کس نام سے جانا جاتا ہے؟
(الف) ابوریجنس (ب) اسکیمو
(ج) مسائی (د) کھرگیز

(7) کینیبلزم (Cannibilism) سے کیا مراد ہے؟
(الف) انسانوں کا شکار (ب) جانوروں کا شکار
(ج) درختوں پر زندگی گزارنا (د) تبادلہ اشیاء

(8) ہندستان میں پسماندہ قبائل کی آبادی کتنی فی صد ہے؟
(الف) 15 فی صد (ب) 7.6 فی صد
(ج) 8.08 فی صد (د) 9.5 فی صد

(9) اسکیمو کا دوسرا نام ہے
(الف) سامی (ب) انسوبٹ
(ج) مایا (د) آئینو

(10) پگمیز باشندے ہیں۔
(الف) کانگوبیسن کے (ب) جنوبی افریقہ کے
(ج) جاپان کے (د) نیوزی لینڈ کے

(11) 'خاموش تجارت' کس قبائلی گروہ کے لوگ کرتے ہیں؟
(الف) بداونس (ب) ماوریز
(ج) پگمیز (د) بوکٹ

(12) بہو رقص کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟
(الف) گیرو (ب) میری
(ج) میٹرو (د) توڈا

(13) مندرجہ ذیل میں کس قبیلے کے باشندے کتے کا گوشت بھی کھاتے ہیں؟
(الف) ناگا (ب) لوشائس
(ج) سنتال (د) یورالی

(14) 1991 کے اعداد و شمار کے مطابق ہندستان کی مجموعی قبائلی آبادی کیا تھی؟
(الف) 70.8 ملین (ب) 75 ملین
(ج) 67.8 ملین (د) 60 ملین

(15) قبائلی لوگوں کی معاشی زندگی کا انحصار کس عمل پر ہوتا ہے؟
(الف) زراعت (ب) شکار اور تلاش غذا
(ج) معدنیات (د) محنت و مزدوری

(16) بوڈو نامی قبیلہ کس صوبے میں علاحدہ سرزمین کی مانگ کر رہا ہے؟
(الف) اروناچل پردیش (ب) ناگالینڈ
(ج) ویسٹ بنگال (د) آسام

(17) قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت کی پالیسی کس بنیاد پر ہونی چاہیے؟
(الف) مذہب (ب) ذات پات
(ج) اقتصادی حالت (د) سماجی پوزیشن

(18) قبیلہ گجر بکروال کی پنچایت کا کیا نام ہے؟

(الف) زرگا (ب) مگرا
(ج) پنچائیں (د) پنچایت

(19) بھوٹ کیا ہے؟
(الف) بھوت (ب) ایک قبیلہ
(ج) ایک سوسائٹی (د) ایک گاؤں

(20) یورالیز اور دارلیز کہاں کے قبائلی باشندے ہیں؟
(الف) کیرالہ اور مہاراشٹر (ب) ویسٹ بنگال اور آسام
(ج) یوپی اور بہار (د) راجستھان اور مدھیہ پردیش

(21) لسنتر قبائلی علاقہ کس صوبے میں واقع ہے؟
(الف) یوپی (ب) بہار
(ج) چھتیس گڑھ (د) تمل ناڈو

(22) بھیل کی بنیادی خوراک کیا ہے؟
(الف) چاول (ب) گیہوں
(ج) مکئی (د) باجرہ

(23) ایک ہندستانی قبیلے کی رسم کے مطابق غیر شادی شدہ لوگ رات کے وقت ایک بڑے ہال میں سوتے ہیں۔ اس قبیلے کا نام بتائیں۔
(الف) بوڈو (ب) کھتیا
(ج) گونڈ (د) ناگا

(24) منڈرا علاقوں میں لوگوں کا بنیادی پیشہ کیا ہے؟
(الف) شکار (ب) زراعت
(ج) جانوروں کو پالنا (د) کان کی کھدائی

(25) کالاہاری صحرا میں کون سے قبائلی باشندے آباد ہیں؟
(الف) ہوٹن ٹوٹ (ب) مسائی
(ج) آئینو (د) بشمین

(26) سنٹرل ایشیا کے ھرگیز کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟
(الف) اسلام (ب) ہندومت
(ج) بدھ مت (د) عیسائی

(27) قبیلہ مسائی کے لوگ بنیادی طور پر کس طرز معاش سے وابستہ ہیں؟
(الف) زراعت (ب) خانہ بدوشی
(ج) صنعتی پیشہ (د) شکار

(28) زولو کہاں کے قبائلی باشندے ہیں؟
(الف) موروکو (ب) نیوزی لینڈ
(ج) جنوبی افریقہ (د) آسٹریلیا

(29) کائیک برف پر چلنے والی ایک کشتی ہے۔ اس کا استعمال کس قبیلے کے لوگ کرتے ہیں؟
(الف) ترک (ب) اسکیمو
(ج) سمویدس (د) پگمیس

(30) ہمارے ملک میں بھیل کہاں کہاں پائے جاتے ہیں؟
(الف) گجرات، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش اور راجستھان
(ب) تمل ناڈو، بہار، بنگال اور کرناٹک
(ج) راجستھان، ہریانہ، جھارکھنڈ
(د) اڑیسہ، آسام اور ہماچل پردیش

(31) بھیل کا سب سے اہم تیوہار ہے۔
(الف) دیوالی (ب) ہولی
(ج) مکر سکرانتی (د) جنم اشٹمی

(32) ہندستان کے کن صوبوں میں گونڈ قبیلے کے باشندے رہائش پذیر ہیں؟
(الف) مدھیہ پردیش اور گجرات
(ب) مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر
(ج) یوپی اور بہار
(د) کرناٹک اور تمل ناڈو

(33) ہندستان میں دوسرا بڑا قبیلہ کون سا ہے؟
(الف) سنتھال (ب) بھیل
(ج) ناگا (د) اپاٹس

(34) منڈا کس صوبے کے قبائلی باشندے ہیں؟
(الف) ہماچل پردیش (ب) مدھیہ پردیش
(ج) بہار (د) تمل ناڈو

(35) 1991 کے اعداد و شمار کے مطابق ہندستان کی قبائلی آبادی کی تعداد کتنے کروڑ ہے؟
(الف) 7.1 کروڑ (ب) 6.78 کروڑ
(ج) 8.5 کروڑ (د) 9 کروڑ

(36) ہندستان میں پسماندہ قبائل کی مجموعی شرح خواندگی کیا ہے؟
(الف) 35 فی صد (ب) 29.60 فی صد
(ج) 25 فی صد (د) 32 فی صد

(37) ہندستانی قبائلی خواتین کی شرح خواندگی بتائیں۔
(الف) 18.19 فی صد (ب) 22 فی صد
(ج) 16 فی صد (د) 15.4 فی صد

(38) مغربی ہمالہ میں ہجرت کر جانے والا خانہ بدوش قبیلہ گجر بکروال مندرجہ ذیل صوبوں میں کس سے تعلق رکھتا ہے۔
(الف) آسام (ب) ہماچل پردیش
(ج) جموں وکشمیر (د) مہاراشٹر

(39) درج ذیل میں سے کون سا قبیلہ مذہب اسلام کا تابع ہے۔
(الف) کھاسی (ب) مینا
(ج) لیپچاز (د) گجر بکروال

(40) اس قبیلے کا نام بتائیں جس میں کسی فرد کی موت کے بعد اس کے رشتے دار و احباب اس کے گرد یکجا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک مردہ آدمی کے منہ میں تھوڑی شراب انڈیلتا ہے اور یہ کہتا ہے "میرے حصے کی شراب پیو۔"
(الف) گیروز (ب) بھیل
(ج) منڈا (د) وارلی

(41) ایک ایسا قبیلہ ہے جس کے لوگ تقریباً ہر چیز کھا سکتے ہیں۔ اس کا نام بتائیں۔
(الف) توڈا (ب) چھلیا
(ج) ناگا (د) گیلونگ

(42) بدوئن (badawins) کی زندگیوں کا مکمل انحصار اونٹ کے پالنے پوسنے پر ہوتا ہے۔ یہ کہاں کے باشندے ہیں؟
(الف) افریقہ (ب) جزیرۃالعرب
(ج) آسٹریلیا (د) روس

(43) وہ چیز یا جانور جس کا کسی قبیلے سے باطنی یا پراسرار تعلق ہوتا ہے اسے کیا کہا جاتا ہے؟
(الف) ٹوٹم (ب) موٹم
(ج) خدائی قوت (د) رڈار

(44) دستور ہند کے تحت پسماندہ قبائل کی صوبہ جاتی لسٹ "ابتدائی قبائل" کی بنیاد پر کس سال کے اعداد و شمار سے تیار کی گئی؟
(الف) 1941 (ب) 1931
(ج) 1961 (د) 1991

(45) قبائلی لوگوں کے بارے میں درج ذیل میں سے کون سا قول صحیح ہے؟
(الف) ان کا رنگ کالا ہوتا ہے
(ب) وہ منگول کے نسلی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔
(ج) وہ عموماً علاحدہ زندگی بسر کرتے ہیں۔
(د) وہ پہاڑیوں پر رہتے ہیں۔

(46) پولینڈری کا مفہوم ہے:
(الف) ایک مرد کا ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنا
(ب) ایک عورت کا ایک سے زیادہ شوہر رکھنا
(ج) بھوت پریت سے شادی رچانا
(د) شادی کے بغیر زندگی گزارنا

(47) اِکزوگیمی سے کیا مراد ہے؟
(الف) اپنے گروہ میں شادی نہ کرنا
(ب) اپنے قبیلے میں شادی کرنا
(ج) غیر ملکیوں سے شادی کرنا
(د) کھیل کے دوران گفتگو نہ کرنا

(48) قبائلی لوگوں کی پسماندگی کا بنیادی سبب کیا ہے؟
(الف) جاہلیت
(ب) جسمانی کمزوری
(ج) دوسرے تہذیبی گروہوں سے بے تعلقی و علاحدگی
(د) خوفزدگی

(49) فورتھ ورلڈ (Fourth World) کی اصطلاح کس کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔
(الف) اصلی ملکی باشندوں کے لیے
(ب) دراوڑوں کے لیے
(ج) منگولوں کے لیے
(د) افریقی باشندوں کے لیے

(50) کھاسی کس صوبے کا قبیلہ ہے؟
(الف) آسام (ب) اڑیسہ
(ج) میگھالیہ (د) جھارکھنڈ

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

□□□

337 E, Brahmaputra Hostel, J.N.U., New Delhi

شہزاد انجم

ساہتیہ اکادمی کا کل ہند سمینار

اطلاقی تنقید: نئے تناظر — رپورتاژ

23 دسمبر 2001 کی دہلی کی شدید سردی اور کہرے بھری فضا میں جب سورج کی کرنوں سے روشنی پھوٹی تو اُس وقت صبح کے ساڑھے دس بجنے والے تھے اور ہندستان کے مختلف شہروں سے آئے ادیبوں اور فنکاروں کے قدم ساہتیہ اکادمی کے رابندر بھون کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں "اطلاقی تنقید: نئے تناظر" کے موضوع پر کل ہند سمینار کا انعقاد اُردو کے صفِ اوّل کے نامور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ایما پر ہونے جا رہا تھا۔ رابندر بھون کے سمینار ہال کی جانب بڑھتے ہوئے بیشتر ناقدین اور فنکاروں کے ذہن میں مختلف سوالات اُبھر رہے ہیں۔ موجودہ عہد مابعد جدید عہد ہے اور جس صورت حال کا سامنا ہے وہ مابعد جدید صورت حال ہے۔ نظریوں کی ادعائیت کے خلاف ردِ عمل، مابعد کالونیل ڈسکورس، ثقافتی جڑوں پر اصرار، مشرقی پہچان، قاری اور قرأت کے عمل پر توجہ، معنی کی نیرنگی، کہانی کی واپسی، بیانیہ کی بحالی، گلوبل کاری اور صارفیت کا چیلنج، برقیاتی میڈیا اور کمپیوٹری کمرشل و اطلاعی یلغار، علم کی خرید و فروخت، ادب اور اقدار کی نئی تعبیر — یہ وہ مسائل اور موضوعات ہیں جن کا سامنا آج کے ادیب کو ہے۔ ادب بھی سماج ہی میں پرورش پاتا ہے اور ادیب بھی اسی سماج کا حصہ اور نمائندہ ہے۔ اسی لیے جب وہ ان مسائل سے جوجھتا ہے تو پوری ذہنی لگن سے آزادانہ فن کی تخلیق کرتا ہے جو اُس کے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے۔ اب فنکار روایتی بندھے ٹکے فارمولوں اور حکم ناموں کی قیود سے آزاد ہو کر باطن کی آواز اور پکار پر شاعری اور فکشن کی تخلیق میں سرگرداں ہے۔ اُس کے سامنے بڑی زمین اور کھلا آسمان ہے۔

ادب اور تنقید کا بے حد گہرا رشتہ ہے۔ تخلیق اور تنقید دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں لیکن ادھر حالیہ چند برسوں میں دونوں کے رشتے میں دراز سی آگئی ہے۔ اس کا شدت سے احساس اس عہد کے نامور ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ہے جو نظریہ سازی اور ذہن سازی کے لیے مانے جاتے ہیں۔ اُن کی تجویز پر اس عہد کے کئی اہم ناقدوں اور فنکاروں کو سابقہ شاعری اور فکشن، معاصر غزل اور نظم، معاصر افسانہ اور معاصر ناول پر غور و فکر اور اظہار خیال کے لیے یہاں مدعو کیا گیا ہے۔ ان مدعوئین کے ذہن میں یہ بھی سوال ہے کہ تنقید کس حد تک اپنی ذمے داریوں کو نبھاتی ہے۔ کہیں تنقید صرف تنقیص اور راستے روکنے کے عمل میں تو مصروف نہیں؟ یا پھر وہ متن کے بجائے ذاتی طرف داریوں کی تبلیغ و تشہیر کر رہی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تنقید نے متن کی معنیاتی زندگی سے خود کو الگ کر لیا ہو، اور صرف لٹی تدابیر کا وظیفہ کر رہی ہو؟ یا تنقید تشریحی، تعارفی، توصیفی ہو کر رہ گئی ہو، یا اپنے تحفظات میں گم؟ جدید ترین تنقید کا اطلاقی منظر نامہ کیا ہے؟

تبھی حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کے سچدانندن، سکریٹری ساہتیہ اکادمی سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور کلیدی خطبے کے لیے پروفیسر حامدی کاشمیری کو دعوت دیتے ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری "معاصر غزل نئے تنقیدی تناظر میں" موضوع پر اپنا مقالہ پڑھتے ہیں۔ "جو تنقید وجود میں آئی وہ روایتی اور ساتھ ہی جدید طریق ہائے نقد سے استفادہ کرتے ہوئے غزل کی نظری طور پر تحسین کاری کرتی رہی۔ غزل کے پورے منظر نامے کو دیکھیے تو خال خال ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو کسی مغربی نظریۂ نقد کو گہرائی اور جامعیت کے ساتھ عملانے پر محیط ہوں اور اطلاقی تنقید کے نام پر جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے وہ شعری متن کے بجائے شاعر کے افکار و خیالات سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ مابعد جدید دور میں کسی سکہ بند یا ادعائی نظریے کے بجائے مختلف النوع طریق ہائے نقد کے لیے راستہ ہموار ہو رہا ہے۔ اس سے تنقید زیادہ ثروت مند اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے، بشرطیکہ وہ متن کی تجزیہ کاری کو اپنا مناسب مقام دے اور اس کی ضابطہ بندی کی طرف توجہ کرے۔" خطبہ صدارت کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ مائیک پر آتے ہیں۔ اُن کی پیشانی کی سلوٹیں اُن کی فکر کی غمازی کرتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "تنقید ادب میں سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے۔ ادب کا کوئی تصور تنقید کے بغیر مکمل نہیں ہے۔" انھوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ "تنقید ادب کی حریف نہیں ہے، ادب کی حلیف ہے۔ تنقید کا کام ادب شناسی، قدر شناسی اور افہام و تفہیم ہے۔" پروفیسر نارنگ نے مصنف، متن اور قاری کو ایک تثلیث قرار دیا اور کہا کہ ان تینوں میں ہر عنصر اپنی اہمیت رکھتا ہے اور ان تینوں ہی کی رُو سے تنقید کے مختلف دبستان وجود میں آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ حیرت انگیز ہے کہ حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" سے اب تک بہ مشکل ایک صدی کا زمانہ گزرا ہے لیکن اردو تنقید نے کلاسیکیت اور رومانیت سے لے کر مارکسیت، وجودیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تک ایک لمبا فاصلہ طے کیا ہے۔ ہندستان کی اُردو تنقید پاکستان کی اُردو تنقید

سے بہت آگے ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد مابعد جدید فکر نے نئے تخلیقی ابعاد روشن کر دیے ہیں۔ اس وقت (1) PostColonialism کی فضا ہے یعنی ذہنوں کو نو آبادیت کے اثرات سے آزاد کرنا۔ (2) تانیثیت پر بھی توجہ کی جا رہی ہے۔ (3) بعض زبانوں میں دلت کا مسئلہ ہے۔ اُردو ادب کا مسئلہ اتنا ذات پات کا نہیں جتنا فرقہ واریت کا ہے۔ (4) اس کے ساتھ ساتھ معنی کی نیرنگی (5) بین المتونیت کا عرفان، (6) ردِ تشکیل (7) تہذیبی پہچان پر اصرار، (8) سماجی معنویت پر از سر نو توجہ (9) کہانی کی واپسی (10) بیانیہ کی بحالی اور (11) قاری کا ادبی مکالمے میں واپس آنا۔ یہ سب کی سب نشانیاں مابعد جدیدیت یعنی جدیدیت کے بعد کی ہیں جن کی انہام و تفہیم تنقید کے ذریعے ہو رہی ہے۔ مندرجہ بالا رویوں کے باعث اصول اور نظریات میں بھی فرق آ رہا ہے۔ لیکن اصولوں اور نظریوں کا میکانکی اطلاق کسی طرح مناسب نہیں۔ " پروفیسر نارنگ نے تنبیہ کی کہ "وہی اطلاقی تنقید معاصر تخلیق سے معاملہ کر سکے گی جو کشادہ ہوگی اور وسعت نظری پر اصرار کرے گی۔ مابعد جدیدیت کسی نظریے کے جبر کو گوارہ نہیں کرتی اور زندگی کو اس کے مسائل اور سماجی سروکار کے ساتھ جشن جاریہ کی طرح منانا چاہتی ہے۔" پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس پر مغز جامع تقریر کے بعد مشہور شاعر اور ساہتیہ اکادمی کے اردو کنوینر جناب بلراج کومل شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پروفیسر نارنگ اپنے آپ میں ایک دبستان ہیں۔ اُن کا مغربی اور ہندستانی ادب کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ انھوں نے ہمارے دور میں آزادیٔ فکر اور اختلاف رائے کو ایک ادبی درجہ دیا۔ انھوں نے کتنے ہی سمینار کرائے جو واقعتاً تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک سمینار یہ بھی ہے۔ بلراج کومل نے کہا متن، قاری، تناظر یہ بنیادی باتیں ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کہانی پن کی واپسی اور قاری کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ آج زبان اور معنی کا تصور بدلا ہے۔ انھوں نے کہا بیسویں صدی کے افسانہ نگاروں میں دس بارہ نام سے آگے کیوں نہیں بڑھتے، نظموں کی بھی وہی صورت ہے۔ ان تمام اہم امور پر توجہ دی جائے گی تاکہ فکر و مباحث کے دروازے وا ہوں۔ کومل صاحب سبھی معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد لنچ کی دعوت دیتے ہیں۔

23 دسمبر 2001 دو بجے دن ساہتیہ اکادمی کے رابندر بھون میں "اطلاقی تنقید: نئے تناظر" کے پہلے سیشن "سابقہ شاعری: نئے تنقیدی تناظر" کی صدارت کے لیے ممتاز شاعر شہریار کو دعوت دی جاتی ہے اور پہلا مقالہ ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی "میراجی۔ ایک نئی تعبیر" کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔ "میراجی نقاد بھی تھے اور تخلیق کار بھی اور دونوں ہی میدانوں میں اپنے معاصرین کے مقابلے کہیں زیادہ امتیاز کے حامل ہیں۔ بحیثیت تنقید نگار اُن کی ذہانت اور غیر معمولی مطالعے کے سبھی قائل ہیں لیکن اُن کی نظمیں ہر دور میں قاری کے لیے چیلنج رہی ہیں۔" دوسرا مقالہ قاضی افضال حسین "مطالعہ راشد کے جہات" پیش کرتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ راشد نے اپنے پہلے مجموعے میں ہی "بحیثیت شاعر" اپنے تخلیقی طریقۂ کار کی اہم جہت کی طرف متوجہ کیا تھا۔ انھوں نے ماضی سے ہمیشہ انکار کیا۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ راشد کے مزاج کی کلاسیکیت الفاظ کے انتخاب اور ان کے باہمی ربط سے نمو کرنے والے آہنگ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اُن کے یہاں الفاظ کا Sophistication اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ تیسرا مقالہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی "اختر الایمان کی نظمیں، تعینِ قدر کا مسئلہ" پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں اختر الایمان اُردو کے پہلے شاعر ہیں جس نے غزل کے پروردہ مزاج کی ترصیع کاری اور اسلوب کی دبازت سے آزاد کر کے اُردو نظم کو غیر مصنوعی فضا میں سانس لینا سکھایا۔ مذہبی بنیادوں سے مربوط تصور کائنات سے اختر الایمان کا رشتہ اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ گہرا ہے۔ آخری مقالہ پروفیسر وہاب اشرفی نے "پرانی اُردو شاعری کا نیا تناظر" موضوع پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا: "جدید ترین تنقید کا اطلاقی منظر نامہ بہت سے جہات سے عبارت ہے۔ یہ منظر کہیں بہت نیا ہے اور کہیں مخلوط انداز میں نمایاں ہے۔ لیکن یہ بات بہت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شعریات کے نئے مباحث نئی تھیوری سے اُبھرے ہیں۔ قدیم اُردو شاعری بھی مابعد جدید شعریات کے حوالے سے تفہیم کے کئی نئے دروازے وا کرتی ہے اور شعری اظہار کے وسیلوں تک پہنچنے میں تہذیبی اور ثقافتی رُخوں سے باخبر کرتے ہوئے ان کی بازیافت کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔"

اس سیشن میں ہر مقالے کے بعد سوالات اور بحث و مباحثہ ہوا۔ نرنجن سنگھ تسنیم، صلاح الدین پرویز، راشد انور راشد، مولا بخش، نظام صدیقی، انیس اشفاق، علی احمد فاطمی، عتیق اللہ نے مباحثے میں حصہ لیا۔ بعض استفسارات کے جواب گوپی چند نارنگ صاحب نے دیے۔ پروفیسر نارنگ فرماتے ہیں خاطر نشان رہے کہ تنقید ہمیشہ کسی نہ کسی زاویۂ نظر سے کی جاتی ہے۔ تمام طرفیں کھلی ہیں، جو پیرایہ آپ چاہیں، جو آپ کا زاویۂ نظر ہے اس کی رو سے آزادانہ لکھیں، جبر کو راہ نہ دی جائے، ادعائیت کو راہ نہ دی جائے، ہم ہر طرح کے جبر کے خلاف ہیں۔ آپ کے پاس کوئی نیا نقطہ نظر ہے تو آپ ضرور پیش کریں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ادب کا کوئی مطالعہ تہذیب کے عرفان کے بغیر ناممکن ہے۔ ترقی پسندی کے بعد اصرار ہوا کہ ادبی مطالعہ صرف چھپے ہوئے صفحے کے چھپے ہوئے الفاظ تک محدود ہوگا۔ زمانہ، تاریخ،

تہذیب، سماج کو نظر انداز کیا گیا۔ ادب کی مطلق Autonomy ایک واہمہ ہے جس میں تیس برس ہم گرفتار رہے۔ ادب میں تاریخ اور تہذیب کی نبض چلتی ہے۔ ادبی اقدار، تصورات، ادبی حسن کے معیار سب تہذیب سے وضع ہوتے ہیں اور تہذیب کی تشکیل ہیں۔ پروفیسر نارنگ کی گفتگو کے بعد پروفیسر شہریار نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ وہ کہتے ہیں "ادھر کچھ دنوں سے مابعد جدید فکر کا جو چرچا ہے، اس سے مجھے خوشی ہے، سماجی سروکار سے رشتہ بنا ہے۔ تہذیب کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ادب کو جو تنہائی، یاسیت، بیگانگی سے منسوب کرتے تھے، اُس رویے میں اب تبدیلی آئی ہے۔ اب ادب میں تہذیب اور سماج کو تلاشا جائے گا جو اہم ہے۔"

آج کے دونوں اجلاس کا اختتام ہو چکا ہے۔ شام بھی ڈھل چکی ہے۔ ساہتیہ اکادمی کی وسیع عمارت سے ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے بزرگ، نوجوان ادبا و شعرا کے قدم دہلی کی سڑکوں پر پڑتے ہیں۔ آپس میں سبھی لوگ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پہلے کے اعلان کے مطابق پروفیسر مغنی تبسم کو پیش کرنا تھا، وہ دہلی تشریف نہیں لا سکے۔ پہلے سیشن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقالہ سننے کے لیے سبھی حاضرین منتظر تھے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے انھوں نے مقالہ پیش نہیں کیا۔ ایک تشنگی سی رہ گئی۔ رات ہو چکی ہے۔ اگلے دن وہ پھر ساہتیہ اکادمی کے اس سمینار میں شریک ہوں گے۔

24/دسمبر 2001

آج دو اجلاس 'ساہتیہ فکشن' اور 'معاصر غزل اور نظم' پر ہونے ہیں۔ معاصر فکشن رائٹر اور معاصر شعرا کافی تعداد میں وقت سے پہلے ہی ساہتیہ اکادمی کے رابندر بھون میں جمع ہو چکے ہیں۔ مقالہ نگار حضرات بھی تشریف لا چکے ہیں۔ اس سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت کے لیے معروف فکشن نویس جوگندر پال کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس سیشن کا موضوع "ساہتیہ فکشن: نئے تنقیدی تناظر" ہے۔ پہلا پرچہ شافع قدوائی "افسانے کی نئی بوطیقا اور انتظار حسین" پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں "انتظار حسین نے نہ صرف موضوعاتی سطح پر ایک متوازی بوطیقا مرتب کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اظہار کی سطح پر بھی بعض فنی حربوں سے خلاقانہ طور پر استفادہ کیا ہے۔ اُن کی فنی بوطیقا علامت، Irony اور حکایتی عنصر سے مرتب ہوتی ہے اور ان کے افسانوں میں علامت، Irony اور متھ (Myth) کا تخلیقی ارتباط نظر آتا ہے۔ انھوں نے ہند اسلامی تاریخ کو جو تہذیب اور حافظے کا حصہ ہے، متوازی تخلیقی تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ اُن کی فنی ہنرمندی پر دال ہے۔ مشرقیت، تہذیبی پہچان اور بیانیے کا حکایتی انداز انھیں مابعد جدید ذہن سے قریب لے آتا ہے۔" دوسرا پرچہ شبنم عشائی نے "گوپی چند نارنگ اور اطلاقی تنقید" پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا گوپی چند نارنگ کی تنقید میں متن، قرأت اور قاری کی اہمیت پر جو مباحث ہیں اُن سے ادب کی تفہیم کے نئے چراغ روشن ہوئے ہیں اور معنی کی شاہراہوں کو وسعت میسر آئی ہے۔ اُن کے یہاں تنقید کا نظریہ نہیں بلکہ فن پارہ یا تخلیق کا عمل فوکس میں رہتا ہے۔ وہ تھیوری کے آدمی ہوں گے لیکن تنقید میں وہ فن پارے کے آدمی ہیں، وہ متن کا تجزیہ کر کے اُس کی روح سے ہم کلام ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ عملی اور اطلاقی تنقید کے نقاد ہیں جو فن پارے پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ شبنم عشائی نے نارنگ صاحب کے بیدی، منٹو، انتظار حسین، میر اور فیض والے مضامین کا بطورِ خاص حوالہ دیا۔ نارنگ صاحب کی نظریاتی اور عملی تنقید نے نہ صرف اُردو ادب بلکہ Philosophy of Literature کے وہ سربستہ راز منکشف کیے ہیں جن کی وجہ سے اُردو ادب کو ایک نئی توانائی حاصل ہوئی ہے۔ اس سیشن میں تیسرا مقالہ پروفیسر صادق "عصمت چغتائی کا افسانوی فن" پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں عصمت چغتائی اردو میں نسوانیت کی توانا آواز ہیں۔ انھوں نے جذباتی محرومیوں، مایوسیوں اور نفسیاتی گھٹن کو اہمیت دی ہے۔ وہ اس مخصوص نظام پر چوٹ کرتی ہیں جو فرسودہ رسم و رواج کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اُن کے افسانوں میں جنس مقصود بالذات نہیں بلکہ 'ذریعہ' بن کر آتی ہے۔ اس اجلاس کا چوتھا پرچہ پروفیسر عتیق اللہ "نیر مسعود کی عجیب الخلقت دُنیا" پیش کرتے ہیں اور نیر مسعود کی افسانہ نگاری کی معنیاتی نیرنگی کے مختلف پہلوؤں اور تہذیبی فضابندی پر اظہار خیال کرتے ہیں، جو اکثروں کے نزدیک مابعد جدید بیانیہ ہے۔ ہر مقالے کے بعد زوردار بحثیں ہوتی ہیں۔ اختلاف و اتفاق کی آوازیں گونجتی ہیں۔ خصوصاً تخلیق کار حضرات اپنی پسند و ناپسند کا اظہار برملا کرتے ہیں۔ جس سیشن میں انیس اشفاق، ساجد رشید، جوگندر پال، قمر رئیس، حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی، علی احمد فاطمی، مشرف عالم ذوقی، نرنجن سنگھ تسنیم، عتیق اللہ، صادق، چودھری ابن النصیر، صلاح الدین پرویز، رفیعہ شبنم عابدی، پیغام آفاقی، محمود ہاشمی، مولا بخش، راشد انور راشد، علی جاوید، شاہینہ تبسم، عنبر بہرائچی اور گوپی چند نارنگ جیسے فنکار بحث میں حصہ لیں اُس سیشن کی گرماگرمی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ مقالہ نگار حضرات استفسارات کا جواب دیتے ہیں اور جوگندر پال اپنے نپے تلے انداز میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "انتظار حسین اور نیر مسعود دونوں کو میں بہت اہم رائٹر مانتا ہوں۔ افسانے میں تخلیق کے جوہر پر اصرار ہونا چاہیے۔ نئی تھیوری سے انحراف کرنا ممکن نہیں۔ تھیوری کے سلسلے میں، میں نے نارنگ صاحب کو کہیں تعصب سے بات کرتے نہیں

دیکھا۔ مابعد جدیدیت آج کی ضرورت ہے، سکۂ بند طریق کار سے باہر نکلنا چاہیے۔ جدیدیت کی آمد سے بھی میں خوش ہوا تھا۔ لیکن اُن کے یہاں تعصبات آگئے۔ مابعد جدیدیت کے حوالے سے ہمارے یہاں آزادیٔ رائے کی بہت گنجائش پیدا ہوگئی ہے۔ شاید اب وقت آگیا ہے کہ ان مسائل پر سوچنا ہمارے لیے ناگزیر ہوگیا ہے۔

"اطلاقی تنقید: نئے تناظر" سمینار کے تیسرے اجلاس کا موضوع "معاصر غزل اور نظم: نئے تنقیدی تناظر" ہے۔ اس کی صدارت کے لیے بلراج کومل کو دعوت دی جاتی ہے اور پہلا مقالہ شین۔ کاف۔ نظام "معاصر غزل، زبان اور موضوع" پیش کرتے ہیں جس میں خورشید اکبر، محمد علوی، عنبر بہرائچی، پریم کمار نظر، پریتپال سنگھ بیتاب، چندربھان خیال، رؤف خیر، عبدالاحد ساز، عالم خورشید، شہباز ندیم، ترنم ریاض، جینت پرمار، شکیل اعظمی کے تازہ کار اشعار کے حوالے سے معاصر غزل سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ معاصر غزل میں موضوع اور لہجے کی یکسانیت نہیں ہے۔ اس کے یہاں غصہ بھی ہے لیکن یہ غصہ جھنجھلاہٹ نہیں ہے۔ اسے اُردو کی روایتوں کا بھی پاس ہے اور اُردو کی اُن شعری روایتوں کا بھی ادراک ہے جسے ولی نے اپنے دوسرے دور میں چھوڑنا چاہا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ معاصر غزل نے تخلیقی تقاضوں کی تکمیل میں ایک نئی زبان، نیا محاورہ وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے تاریخ اور تہذیب کو پہچاننے میں تہذیب کو فوقیت دی ہے۔ دوسرا مقالہ نظام صدیقی "معاصر غزل: نئے تنقیدی تناظر" عنوان کے تحت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معاصر غزل نئے ہزارے کی نئی تخییت، عصری زبان میں حکمت و عرفان آشنا ہے جو بیک وقت شاعرانہ اور اکثر پیمبرانہ محبت اور بصیرت کا تخلیقیت افروز مکاشفہ ہے۔ معاصر غزل، روایت، ترقی پسندی، جدیدیت کا ارتفاع کر کے مابعدِ جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک کی روح کو سموئے ہوئے ہے۔ اس سیشن میں تیسرا مقالہ قاضی جمال حسین "معاصر نظم ـــ تنقید، تناظر اور شناخت کا مسئلہ" پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ثقافتی تنوع اور تہذیبی تشخص کی آئینہ داری میں نظم کہیں زیادہ بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ قاضی جمال حسین، آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس اور مہتاب حیدر نقوی کی مثالیں پیش کر کے کہتے ہیں کہ معاصر نظم اپنے ثقافتی تشخص کو اپنا بنیادی حوالہ سمجھتی ہے۔ لیکن اس مقالے پر سبھی موجود فنکاروں کو حیرت ہوتی ہے کہ اس مقالے میں کئی اہم معاصر نظم گو شعرا کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ ماحول میں کافی گرمی اور شدت آجاتی ہے اور جانبداری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ چوتھا مقالہ حقانی القاسمی "معاصر اردو نظم: نئے تناظر" عنوان کے تحت پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں اگر تنقید کا کوئی معتبر منظر نامہ تشکیل دینا ہے تو تعصبات اور تکلفات سے ماورا ہو کر غیر جامعاتی انداز میں اپنے عہد کی شاعری کا مطالعہ کرنا ہوگا اور یہ واضح کرنا ہوگا کہ اُردو نظم کی تاریخ اختر الایمان پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ہمارے عہد کے شعرا اُردو نظم کی تاریخ میں نئے اور مستحکم باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔ اس سیشن میں پانچواں مقالہ بھوپندر عزیز پریہار پیش کرتے ہیں۔ اس سیشن کے سبھی مقالات پر زوردار بحثیں ہوئیں، تعصبات پر سخت اعتراض ہوئے لیکن افہام و تفہیم کے در بھی وا ہوئے اور سمینار کو ایک نیا رُخ عطا ہوا۔ نظام صدیقی، صلاح الدین پرویز، ش۔ ک۔ نظام، گوپی چند نارنگ، فرحت احساس، اسلم جمشید پوری، محمود ہاشمی، انیس اشفاق، وہاب اشرفی نے ان مباحث میں حصہ لے کر ادب و شاعری کی کئی پرتوں اور ابعاد پر خوب خوب روشنی ڈالی جس سے سمینار کی وقعت میں اضافہ ہوا۔ اجلاس کے صدر بلراج کومل نے سبھی مقالہ نگاروں اور شرکائے بحث کا شکریہ ادا کیا۔

25/دسمبر 2001

"اطلاقی تنقید: نئے تناظر" سمینار کے تیسرے دن رابندر بھون کے ہال میں ادبا و شعرا آچکے ہیں۔ چوتھے اجلاس کی صدارت کے لیے مشہور ناقد پروفیسر وہاب اشرفی کو دعوت دی جاتی ہے۔ اس اجلاس کا موضوع "معاصر افسانہ: نئے تنقیدی تناظر" ہے جس میں پہلا مقالہ سیفی سرونجی پڑھتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری تنقید کو چاہیے کہ تخلیق کے ماحول اور ہمارے دیش کی مٹی، اس کی بھینی بھینی خوشبو کو سمجھے اور نئی فکریات کو دھرتی کا حوالہ بنائے۔ دوسرا مقالہ مولا بخش "معاصر افسانہ: نئے تنقیدی تناظر" کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں معاصر افسانہ دراصل مابعد جدید افسانہ ہے اور یہ رجحان اور رویہ ہے جس میں کہانی ہے۔ نثر سے شاعری کی دوستی کسی پولیس والے سے رشتے کی طرح ہے جس کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی اور پھر یہ کہ شاعرانہ اسلوب میں افسانہ لکھنے کا زمانہ لد گیا۔ تیسرا مقالہ نعیم اشفاق "معاصر اُردو افسانہ: نئے تنقیدی تناظر" پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں معاصر اُردو افسانہ نئے تنقیدی رویّوں کے تناظر میں اب اتنا تناور ہو چکا ہے کہ کسی بھی زبان کے افسانے سے ہماری زبان کا افسانہ آنکھیں ملا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں اس کی عمدہ مثالیں سریندر پرکاش، نیر مسعود، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف اور مشرف عالم ذوقی کے افسانے ہیں۔ نیر مسعود کے افسانوں سے مابعد جدید عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سیشن میں چوتھا مقالہ بیگ احساس "معاصر افسانہ: نئے تنقیدی تناظر" پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جدید افسانے کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس نے روایت کا احترام نہیں کیا بلکہ کتھا کہانی کی اچھی روایتوں سے انحراف کیا اور خلا میں جھولنے لگا۔ جبکہ

مابعد جدید افسانے میں قاری کی شمولیت اور قاری سے مخاطبت کے پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ یہ کسی فارمولے کا شکار ہوئے بغیر کھلی ذہنی فضا میں مختلف جہتیں اور امکانات تلاش کرتا ہے تو افسانے کا کھویا ہوا قاری یقیناً بحال ہوگا۔
اس اجلاس کا آخری مقالہ بلراج کومل "معاصر افسانہ: نئے تنقیدی تناظر" کے عنوان سے پڑھتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ معاصر افسانہ موضوعاتی اعتبار سے متنوع ہوا ہے۔ اس میں سماج کے مختلف طبقات کی عکاسی کے شواہد موجود ہیں لیکن ان کے معیار و مرتبے پر رائے دینا، پیش رو افسانے سے موازنہ کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ بلراج کومل نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ کچھ معاصر افسانہ نگار ناقدین کے شکوہ گزار ہیں لیکن ان کی چشم توجہ کے اشارے کے منتظر بھی رہتے ہیں۔ ان مقالات پر پیغام آفاقی، شافع قدوائی، محمد صلاح الدین پرویز، راشد انور راشد، شیخ عقیل احمد، ارتضٰی کریم، ارشاد نیر، اسلم جمشید پوری، رضوان الحق اور محمد سہیل صاحبان اپنے سوالات اور تحفظات پیش کرتے ہیں۔ جن کے جواب مقالہ نگار حضرات دیتے ہیں اور پھر گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں کہ ادب میں اختلاف رائے کا احترام کرنا چاہیے۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے مخالف کی باتوں کو سنو، ممکن ہے اس میں بھی سچائی کا کوئی پہلو ہو۔ ادبی خلوص، دیانتداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس سمینار میں دوست دشمن سبھوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ یہ سمینار ایک علمی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ زمانی بعد فن پارے کی اہمیت کے مسلم ہونے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کسی فن پارے کی اہمیت قائم ہونے میں کبھی کبھی نصف صدی لگ جاتی ہے۔ وقت کے محور پر جو زندہ رہے گا وہی فن پارہ ہے۔
اس کے بعد پروفیسر وہاب اشرفی اپنے صدارتی خطبے میں کہتے ہیں کہ ہم جو مابعد جدیدیت کا تصور لے کر چلے ہیں، یہ برین واشنگ نہیں ہے۔ آپ سوچیے اس میں کیا اہم ہے۔ کلی طور پر مابعد جدیدیت ہمیں جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ کشادہ ذہنی اور روشنی عطا کرتی ہے، ماتمی فضا سے نکلنا چاہتی ہے۔ پچھلے ادب کو ریجکٹ نہیں کرتی لیکن اس سے مختلف اور آگے ہے۔

سمینار کے پانچویں اجلاس کا موضوع "معاصر ناول: نئے تنقیدی تناظر" ہے جس کی صدارت کے لیے مشہور ناقد پروفیسر قمر رئیس کو دعوت دی جاتی ہے اور پہلا مقالہ ڈاکٹر خورشید احمد "راجندر سنگھ بیدی کی تنقید نگاری: نئے تنقیدی تناظر" پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بیدی سے متعلق جو بھی تنقیدی سرمایہ فراہم ہوا ہے، وہ کمیت میں وافر ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقیدی کاوشوں سے قطع نظر بڑے پیمانے پر Critical Insights میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ دوسروں کے یہاں کچھ نکتہ آفرینیاں ہیں لیکن ضمنی نوعیت کی۔ نارنگ صاحب کی اطلاقی تنقید کے ذریعے فکرِ بیدی کو جو بلندی اور برگزیدگی نصیب ہوئی ہے اس کی مثال اُن کے پہلے اور اُن کے بعد بھی ناپید ہے۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر ارتضٰی کریم "معاصر ناول: نئے تنقیدی تناظر" پر پڑھتے ہوئے فرماتے ہیں "اُردو میں تخلیق بہت پس پشت رہ گئی ہے اور تنقید نے برگد کے پیڑ کی طرح سایہ قائم کر رکھا ہے۔" تیسرا مقالہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی "معاصر اُردو ناول: نئے تنقیدی تناظر" پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کے دور میں اُردو میں ناول کو آج بھی سنگھرش کرنا پڑ رہا ہے۔ فاطمی صاحب کہتے ہیں اب ناول صرف تفننِ طبع یا وقت گزارنے کی چیز نہیں رہا بلکہ صدیوں کے سامراجی غلبے کی وجہ سے بکھرتا ہوا، جوجھتا ہوا نئی مشکل میں ایک نئی جدلیت و بصیرت سے دوچار ہے۔ اس سیشن کا چوتھا مقالہ پروفیسر انیس اشفاق "معاصر ناول: نئے تنقیدی تناظر" کے عنوان سے پڑھتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کر سکتے کہ موجودہ زمانے میں نئی ادبی فکریات کی روشنی میں ہماری پرانی بصیرتوں سے جو نئی بصیرت کشید کی گئی ہے وہ بامعنی ہوتی جارہی ہے۔ بصیرت کی جستجو ہم نے انھی اصولوں سے کی ہے جنھیں مابعد جدید تنقید نے اپنی شناخت کے لیے مقرر کیا ہے۔ انھوں نے معاصر ناول کا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی پیش کرتی ہیں اور بڑے اعتماد سے کہتی ہیں کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب اُردو کا ناول نگار مغرب کے مانگے کے اُجالے کا قائل نہیں رہا۔ وہ نہ تو مارکس کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے، نہ فرائیڈ میں پناہ تلاش کرتا ہے اور نہ سارتر کا دامن تھامتا ہے۔ اب اُس کے پاس اپنے مسائل ہیں، موضوعات ہیں۔ انھوں نے بالخصوص نسوانیت ڈسکورس کے حوالے سے معاصر اردو ناولوں سے بحث کی۔ ان مقالات پر مباحث کے دروازے وا ہوئے جن کے جواب مقالہ نگار حضرات نے دیے۔ آخر میں پروفیسر قمر رئیس اپنے صدارتی خطبے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ایسا تاریخ ساز سمینار گذشتہ تیس چالیس برس میں نہیں ہوا ہے۔ 1967 میں جدیدیت پر علی گڑھ میں سمینار ہوا تھا۔ اس کے بعد اتنا اہم سمینار یہ ہوا جس میں بہت ذہین، فعال تخلیقی فنکاروں نے حصہ لیا۔ یہ سمینار یقیناً تاریخ کا ایک حصہ ہوگا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ مابعد جدیدیت کے نام سے جو نیا فکری سفر شروع ہوا اُس میں یقیناً پہلا نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس کے ان کلمات کے بعد سمینار کے اختتام کا اعلان ہوتا ہے، لیکن حاضرین خود کو اس سمینار میں ہونے والی بحثوں سے آزاد نہیں کر پاتے۔ خصوصی طور پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہ افکار کہ تنقید کا سارا کھیل مصنف، متن اور قاری ان تین نشانات پر مرتکز ہوتا ہے۔ تنقید کبھی

غیر جانبدار یا معصوم نہیں ہو سکتی، آج کی تنقید ہندستان میں پاکستان سے بہت آگے ہے، معنی کی تکثیریت آج تنقید میں جس طرح قبول کی جا رہی ہے اس کا اثر تخلیق پر ہو رہا ہے، زبان اپنے فیصلے خود کرتی ہے، ہر سماج اپنی زبان خود خلق کرتا ہے، ادب تہذیب کا چہرا ہے، تہذیب سے ہٹ کر نہ شعریات ممکن ہے نہ ادب نہ تنقید، نئی فکریات حکم نامے نہیں دیتی، اس کی بصیرتوں سے ذہنی تخلیقی فضا بدل چکی ہے۔

اس سمینار میں سابقہ شعرا میں میرا جی، ن۔ م۔ راشد اور اختر الایمان کو پیش کیا گیا، اگر علی سردار جعفری اور مجروح سلطانپوری بھی ہوتے تو اچھا ہوتا۔ بحیثیت فکشن رائٹر راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، انتظار حسین اور نیر مسعود کے فن پر مقالے پڑھے گئے۔ کرشن چندر، منٹو اور سریندر پرکاش بھی زیر بحث رہے۔ بیشک نقاد فکر کے اعتبار سے کبھی غیر جانبدار نہیں ہو سکتا اور پھر یہ بھی کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند، فکریات کے اعتبار سے اپنی پوزیشن اختیار کرنے کے لیے آزاد ہے۔ عام رائے تھی کہ اُردو سمیناروں کی تاریخ میں یہ ایک شاندار اور یادگار سمینار تھا جس میں سینکڑوں ذہین تخلیقی فنکاروں نے حصہ لیا اور ملک کے بعض نامور ناقدین شریک بحث رہے۔ اس کی گونج تادیر قائم رہے گی جس کے لیے بجا طور پر پروفیسر گوپی چند نارنگ ستائش اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

□□□

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110 066.

Ph.: 6109746, 6169416 Fax: 6108159 E-mail: urdueducation@hclinfinet.com

خوش خبری

کتابوں کی نمائش و فروخت
آپ کے شہر آپ کے گاؤں میں

خوش خبری

براہ کرم تبدیل شدہ تاریخیں نوٹ فرمالیں

اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں قومی اردو کونسل کا اگلا قدم موبائل وین کا انتظام ہے تاکہ کونسل کی مطبوعات دور دراز علاقوں میں بھی آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔ اس وین میں قومی اردو کونسل اور نیشنل بک ٹرسٹ کی اردو کی تمام مطبوعات (ہر موضوع پر سبھی عمر کے لوگوں کے لیے) نمائش و فروخت کے لیے رکھی جائیں گی۔ یہ وین اپنے پہلے مرحلے میں اتر پردیش کے تقریباً ان سبھی علاقوں میں جائے گی، جہاں اردو پڑھنے والے کثیر تعداد میں ہیں۔ پروگرام حسب ذیل ہے۔

9 تا 11 اپریل	سہارنپور	23 تا 25 اپریل	مراد آباد
11 تا 13 اپریل	دیوبند	26 تا 28 اپریل	رامپور
13 تا 16 اپریل	مظفر نگر	29 اپریل تا 1 مئی	بریلی
17 تا 19 اپریل	میرٹھ	2 تا 4 مئی	بدایوں
20 تا 22 اپریل	امروہہ	5 تا 7 مئی	شاہجہانپور

نوٹ: شناختی کارڈ دکھانے پر اساتذہ اور طلباء کے لیے 40% رعایت

اردو خبر نامہ

شمس الرحمان فاروقی کو اعزازی ڈی لٹ

● 26/ فروری 2002 کو منعقد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے 53ویں کنووکیشن میں جناب شمس الرحمان فاروقی کو اعزازی ڈی لٹ (Doctor of Letters Honoris Causa) سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر یونی ورسٹی کی جانب سے ان کی خدمت میں جو سپاس نامہ پیش کیا گیا اس کے متن کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"اپنے معاصرین اور وقت کی ضرورتوں کے مطابق لکھنے والے اسکالروں اور نقادوں میں بعض ایسے دانش ور بھی بسا اوقات پیدا ہو جاتے ہیں جو انسان کے ذہنی اور روحانی سفر کے ارتقا میں مستقل اضافے کا منبع بن جاتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے۔

محترم نائب امیر جامعہ! اردو کے معروف مصنف، نقاد، ادبی، مفکر، مدیر، افسانہ نگار، لغت شناس اور ماہر میر و غالب جناب شمس الرحمان فاروقی کا تعارف آپ کے روبرو پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد فخر و انبساط کا احساس ہو رہا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

شمس الرحمان فاروقی 15/ جنوری 1936 کو پیدا ہوئے۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد آپ نے اعظم گڑھ میں استاد کی حیثیت سے اپنا کیریر شروع کیا۔ اس کے بعد سول سروس امتحان پاس کر کے وہ انڈین سول سروس سے وابستہ ہوگئے۔ وہ صوبہ بہار کے پوسٹ ماسٹر جنرل، نئی دہلی کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل پوسٹل، یوپی کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل اور حکومت ہند کے ممبر پوسٹل سروس بورڈ کے عہدوں پر فائز رہے۔ ان انتظامی عہدوں کے علاوہ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سمیت اندرون و بیرون ملک کئی مقتدر دانش گاہوں میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

شمس الرحمان فاروقی ایک مفکر، مصنف اور نابغہ روزگار شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے 38 سے زیادہ عالمی شہرت یافتہ کتابیں وسیع تر ادبی منظر نامے کو دی ہیں۔ ادبی تنقید سے لے کر عروض و بلاغت تک، فکشن اور شاعری سے لے کر انگریزی اور فرنچ زبانوں میں ترجمے تک ان کا قلم یکساں خوبصورتی اور روانی سے ہر موضوع کو اپنی دانش ورانہ دقیق نظری اور باریک بینی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا رہتا ہے۔

جناب فاروقی اردو میں جدیدیت کے معمار اور نظریہ ساز ہیں۔ نہایت اختصار اور خوش اسلوبی سے انھوں نے "جدیدیت" کی اصطلاح وضع کی اور اس کو معیار و مفہوم عطا کیا۔ "جدیدیت" کی تھیوری وضع کرنے اور برتنے کے علاوہ شمس الرحمان فاروقی نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی شاعری اور ادبی تھیوری، اطلاقی کلاسیکی علم عروض اور مابعد نوآبادیت اردو مطالعات کے میدان میں بڑا کام کیا ہے۔

ہند ایرانی فکر اور شعری روایت کی عمیق فہم اور نئی زندگی کے ادبی ادراک کے ساتھ اس کی ماہرانہ آمیزش سے شمس الرحمان فاروقی نے غالب اور میر کی شاعری کی تعبیرات کو ایک بالکل ہی نئی جہت دی ہے۔ "شعر شور انگیز" کی چار جلدوں میں انھوں نے میر کی غزل کے پر فریب سحر کو گرفت میں لیا ہے جس میں غیر معمولی ادبی بصیرت اور انسانی جذبات کے تئیں نقاد کی حسیت منعکس ہے۔

"تفہیم غالب" غالب کی شاعری کی شرح کی روایتی، جدید اور ذاتی تجربات کے عناصر کی مسحور کن آمیزش ہے۔ اس اہم ترین شرح کی اپروچ پوری طرح سے اکادمک ہوتے ہوئے بھی، موضوع سے فاروقی صاحب کی ذاتی دل چسپی ہر لفظ میں نمایاں ہے۔

تفسیر و تشریح کے میدان میں فاروقی صاحب کی فہم پر حرف زنی کی گنجائش نہیں۔ اپنی اس غیر معمولی علمی فہم و فراست کے سبب انھوں نے اردو شاعری کے ارتقائی سفر کے مدارج کو تاریخی تسلسل میں دیکھا وہ تفہیم شعر کی اس تھیوری کے موجد ہیں کہ "نظم کی قرات کے لیے ذہن کو آمادہ کرنے کا نام فہم نہیں ہے بلکہ فہم خود اپنے آپ میں نظم ہے۔"

شمس الرحمان فاروقی کی ادبی تنقید کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشرق و مغرب کے بہترین عناصر کا امتزاج ہے۔ مشرقی شعریات کے تئیں اپنی فطری صلاحیتِ امتیاز اور مغربی ادبی رجحانات پر مکمل دسترس کے سبب وہ ان دونوں کے امتزاج سے ملی جلی تاثیر کی کیفیت کمال مہارت سے نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی کتابیں: لفظ و معنی، شعر غیر شعر اور نثر، تنقیدی افکار، اثبات و نفی، غالب پر چار تحریریں، اردو غزل کے اہم موڑ، عروض آہنگ اور بیان، درس بلاغت وغیرہ ان کے طویل تنقیدی سفر کے اہم سنگِ میل ہیں۔

فاروقی صاحب اردو کے اوّلیں اسکالر ہیں جنھوں نے رومانوی ادب کی زبانی روایت پر جامع کام روایت، زبانی روایت اور اختراع کی روشنی میں کیا ہے۔ اپنی کتاب "ساحری، شاہی اور صاحب قرانی" میں داستانِ امیر حمزہ کی 46 جلدوں پر مشتمل طویل داستان کا بہت جامع مطالعہ انھوں نے پیش کیا ہے۔

شمس الرحمان فاروقی کی معرکتہ الآرا تصنیف "اردو کا ابتدائی زمانہ" ہندستان میں اردو زبان اور اس کی تاریخ کے مطالعات میں اہم ترین اضافہ ہے۔

جناب فاروقی برِصغیر کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادبی مجلے "شب خون" کے بانی مدیر ہیں۔

وہ صرف ایک نقاد ہی نہیں بلکہ تخلیق کار بھی ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں، گنج سوختہ، سبز اندر سبز اور آسماں محراب میں ان کا شعری ڈکشن اور فکر جدید اردو شاعری میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اپنے افسانوی مجموعے "سوار اور دیگر افسانے" کی اشاعت کے ساتھ انھوں نے اپنے آپ کو ایک اہم فکشن رائٹر کی حیثیت سے بھی منوالیا ہے۔

شمس الرحمان فاروقی نے ارسطو کی "بوطیقا" کے بوچر کے متن کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ انھوں نے اردو کی معروف کلاسیکی تصنیف "آبِ حیات" کا انگریزی ترجمہ کولمبیا یونی ورسٹی کی پروفیسر پریچٹ کے اشتراک سے کیا ہے۔

آج کل وہ اردو کے متروک اور قدیم الفاظ کا لغت تیار کرنے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں لگے ہیں۔ یہ کام اردو کے اسکالروں کے لیے بے حد اہمیت کا حامل ہوگا۔

فاروقی صاحب کو اپنے کارہائے نمایاں کے لیے جن کل ہند اور بین الاقوامی سطح کے اعزازات سے نوازا گیا ہے وہ ان کی ادبی فتوحات کا بیّن ثبوت ہیں۔ کچھ اعزازات یہ ہیں:

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ، میر اکادمی ایوارڈ، مغربی بنگال اردو اکادمی ایوارڈ وغیرہ۔ 1996 میں شمس الرحمان فاروقی کو برِصغیر کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ "سرسوتی سمان" سے نوازا گیا۔ ان خدمات کے پیشِ نظر شمس الرحمان فاروقی کو ہمارے عہد کی زندہ روایت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

عمر ہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ ای
چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

جناب نائب امیر جامعہ! مودبانہ التماس کے ساتھ اب آپ سے جناب شمس الرحمان فاروقی کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو پر یک روزہ قومی سیمینار

● نئی دہلی، 19 / فروری۔ اٹھارھویں صدی کے مشہور شاعر سراج الدین علی خان آرزو کی حیات و خدمات کے اعتراف میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ہونے والے ایک روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد نے خانِ آرزو کو فارسی زبان و ادب کا ایک نابغۂ روزگار عالم و شاعر قرار دیا۔ انھوں نے خان آرزو کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کی ہمہ گیری ہے۔ وہ بیک وقت فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں دسترس رکھتے تھے۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ شاہد ماہلی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ کلاسیکی شعراء اور ادیبوں پر سیمینار اور لکچر کرانا غالب انسٹی ٹیوٹ کی پرانی روایت رہی ہے۔ خان آرزو پر منعقد ہونے والا یہ سیمینار اس عظیم شاعر کی بازیافت ہے جسے قومی سطح پر پہلی مرتبہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے یاد کیا ہے۔ سیمینار کا پہلا اجلاس ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور پروفیسر وارث کرمانی کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ سرورالہدیٰ نے خان آرزو کے اردو کلام اور ان کے معاصرین کے کلام کے تقابلی مطالعے کی شکل میں پیش کیا۔ اس اجلاس کا دوسرا مقالہ "علی حزیں اور خان آرزو کا ادبی معرکہ" کے عنوان سے ڈاکٹر ریحانہ خاتون کا تھا۔ اس کے علاوہ "آرزو اور اس کا تذکرہ مجمع النفائس" کے عنوان سے ڈاکٹر نور الاسلام کا مقالہ، "فارسی میں ادبی تنقید کی روایت اور تنبیہ الغافلین" کے عنوان سے پروفیسر شریف حسین قاسمی کا مقالہ اور غرائب اللغات پر ادر نوادر الفاظ کے موضوع پر ڈاکٹر خلیق انجم کا مقالہ شاملِ اجلاس تھا۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔

دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر عراق رضا زیدی نے "وطن پرست خان آرزو کی اصلاحیں" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ دیگر مقالوں میں پروفیسر وارث کرمانی اور رشید حسن خاں نے خان آرزو کی حیات و خدمات پر بڑی ناقدانہ بحث کرتے ہوئے ان کی شاعری کے حوالے سے چند نئے گوشوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بھی خان آرزو کے شعری مرتبے پر اظہار خیال کیا۔ اجلاس کی صدارت کے لیے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر شمیم حنفی کو زحمت دی گئی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر ابنِ کنول نے انجام دیا۔

سیمینار کے اختتامی اجلاس میں ہندستان اور ایران کے فارسی اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار علمی دنیا میں خان آرزو کی شخصیت کو مزید متعارف کرانے میں اہم رول ادا کرے گا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمود فیاض نے کی۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

[illegible]

● نئی دہلی،6؍ فروری۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سیمینار روم میں "میر کی دلّی" کے موضوع پر ایک توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ توسیعی لکچر عربی، اردو اور فارسی زبان کے ممتاز اسکالر اور ادیب و نقاد پروفیسر نثار احمد فاروقی نے دیا اور صدارت انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا استقبال کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر عبدالرحمان ہاشمی نے کہا کہ "فاروقی صاحب نے میر فہمی کی راہیں کھولی ہیں۔ انھوں نے میر کی سوانح اور شاعری کو اس وقت موضوع بنایا جب اردو کے ناقدین عام طور پر اس پر توجہ نہیں دے رہے تھے۔" توسیعی خطبے میں نثار احمد فاروقی نے میر کی دلی کی سیاسی، جغرافیائی اور تہذیبی جہات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ اس زمانے میں سیاسی بحران اور معاشی بدحالی کے باوجود ہر علم و فن کے اتنے اور ایسے باکمال لوگ دلی میں جمع ہوگئے تھے کہ پھر کسی چشم فلک نے تابناک ستاروں کا ایسا جھرمٹ نہیں دیکھا۔ دلی اجڑ کر بھی سارے ہندستان کے لیے ادب، شعر، تہذیب، لباس، طعام اور عام رسم و رواج کا مستند نمونہ اور معیار بنی رہی۔ پروفیسر فاروقی نے دلی کے مختلف علاقوں لال قلعہ، جامع مسجد، چاندنی چوک، اجمیری گیٹ، حوض خاص، رام لیلا گراؤنڈ، موری گیٹ اور اس جیسے دلی کے دوسرے علاقوں کا شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا اور بتایا کہ آج سے دوسو برس پہلے کی دلی اس وقت ہر اعتبار سے ایشیا کا ایک عظیم شہر تھی۔

پروفیسر فاروقی نے میر کی دلی کے تعلق سے 1722ء سے 1780ء تک ساٹھ سال کا احاطہ اپنے لکچر میں کیا اور اس عہد کی ہمہ جہت تہذیبی، سیاسی، جغرافیائی اور معاشی سرگرمیوں کا حوالہ دیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے صدارتی کلمات میں کہا کہ نثار احمد فاروقی کے مقالے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ فاروقی صرف ادیب ہی نہیں، بلکہ سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور بھی رکھتے ہیں۔ ان کے اس خطبے سے میر کی دلی کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ خلیق انجم نے کہا کہ اس عہد کے شہر آشوب سے مغلیہ سلطنت کو بھی آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔

(قومی آواز، دہلی)

[illegible]

● مرزا غالب کے 133ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 33ویں یوم تاسیس کے موقعے پر غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا اور مزار غالب پر گل پوشی کی گئی۔ اس موقعے پر پروفیسر شارب ردولوی صاحب نے "غالب کی عصری حسیت" کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کیا۔

انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ غالب کا عہد خود بڑی کشمکش کا عہد تھا جس میں ایک تہذیب ختم ہو رہی تھی اور دوسری تہذیب اپنی جگہ بنا رہی تھی، جہاں سیکڑوں سال پرانے سیاسی نظام کا سورج غروب ہو رہا تھا اور ایک نئے سیاسی نظام کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، ایک فکر کی لو مدھم پڑ رہی تھی اور زندگی کے بارے میں ایک نیا رویہ اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے غالب کا عہد ایک عصری حسیت کا عہد نہیں بلکہ بہ یک وقت کئی حسیتوں کا عہد تھا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے خطبے میں آگے کہا کہ غالب دراصل جامد عقیدے کے انسان نہیں ہیں۔ ان کے یہاں بلا کا عقلی اوراک ہے۔ اسی عقلی اوراک نے ان کے یہاں آزاد روی اور آزاد خیالی پیدا کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب ایک نظریہ ساز شاعر تھے۔ اس اصطلاح کو صرف سیاسی معنوں میں نہ لیا جائے، حالاں کہ سیاسی معنوں میں بھی غالب کے نظریے کا ذکر تقریظ آئین اکبری کے سلسلے میں آچکا ہے۔ لیکن غالب تہذیبی اور سماجی ہر طور پر ایک نظریہ ساز ہیں اور ان کا نظریہ ان کی شعری جمالیات کا حصہ ہے۔

اس موقعے پر جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ غالب کا کلام دور حاضر کی حسیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس موقع پر پرویز ظہور نے غالب کی غزل پیش کی اور متین امروہوی نے غالب کی زمین میں غزل پیش کی۔ ڈاکٹر عقیل احمد کے شکریے کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔ تقریب کی صدارت جناب جوگندر پال نے فرمائی۔ (ڈاک سے)

[illegible]

● دھارواڑ، یکم مارچ۔ کرناٹک اردو اکادمی بنگلور ہر سال کسی موضوع پر توسیعی خطبے کا اہتمام کرتی ہے جو کرناٹک کے مختلف شہروں میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس بار کرناٹک یونی ورسٹی دھارواڑ میں شعبۂ اردو اور فارسی کے اشتراک سے توسیعی خطبے کے لیے پروفیسر نثار احمد فاروقی، سابق صدر شعبۂ عربی دہلی یونی ورسٹی کو دعوت دی گئی۔ اس خطبے کا موضوع "اردو کی شعری روایت اور کلام غالب کی امتیازی خصوصیات" تھا۔ یہ جلسہ 27؍ فروری کو صبح گیارہ بجے دھارواڑ یونی ورسٹی کے ٹرانزٹ ہاؤس میں ہوا جس کی صدارت اکادمی کے چیرمین ڈاکٹر وہاب عندلیب نے کی۔ مہمانِ خصوصی یونی ورسٹی سنڈیکیٹ کے رکن پروفیسر ایس عبدالکریم تھے۔ اس محفل میں شرکت کے لیے یونی ورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور طالبات کے علاوہ بہت سے علم دوست اور ادب نواز حضرات بلاری، بیلگام، بیجاپور، شیموگا، ہبلی، میسور اور بنگلور سے بھی آئے

تھے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ، صدر شعبۂ اردو فارسی نے مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا۔ گلپوشی کے بعد پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اپنے سوا گھنٹے کے لیکچر میں اردو کی شعری روایت کے عہد بہ عہد ارتقا کا مختصر جائزہ لیا، اور پھر مرزا غالب کی شاعری کے مختلف ادوار اور اُن میں اُسلوب وادا اور مضامین و معانی کی درجہ بہ درجہ تبدیلی کا مثالوں کے ساتھ تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ "غالب کے دیوان کی پہلی روایت، جو "نسخہ امروہہ" کہلاتی ہے، اُس وقت تیار ہو چکی تھی جب غالب کی عمر 19 سال سے زیادہ نہ تھی۔ دوسرے دور میں جب اُنھیں اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں طویل عرصے تک کلکتے میں رہنا پڑا اور انھوں نے وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور انگریزوں کی معاشرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، تو اُنھیں پوری طرح یہ احساس ہو چکا تھا کہ زمانہ اپنا قالب بدل رہا ہے۔ بعد کے زمانے میں اُن کی اقتصادی بدحالی، پھر 1857ء کی شورش اور اُس کی ناکامی، سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ، سقوطِ دہلی کے بعد دہلی کی تباہی اور اسی نوعیت کے آلام و مصائب کا ذاتی تجربہ ہوا۔ ان سب حالات نے غالب کی قوت متفکرہ کو متاثر کیا اور اُن کا اسلوب سادہ، سہل اور بہ غایت دلنشیں ہو گیا، یہی وہ اسلوب ہے جس نے اُنھیں اردو کے شاعروں کی صف میں نہایت ممتاز مقام دیا ہے۔

خطبے کے بعد مہمانِ خصوصی پروفیسر عبدالکریم اور صدر جلسہ ڈاکٹر وہاب عندلیب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (ڈاک سے)

مزارِ غالب پر تقریب اور طرحی مشاعرہ

● نئی دہلی، 16، فروری غالب انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی اردو ہند (دہلی شاخ) کے زیرِ اہتمام یوم غالب کے موقعے پر مشہور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غالب اور ہندستانی تہذیب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب ملکوں کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو سلطانوں کا ذکر ہوتا ہے مگر جب ملک کی تہذیبی تاریخ لکھی جاتی ہے تو شاعروں کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ غالب ہندستان کا وہ عظیم شاعر ہے جو کتنے عرصے سے پوری دنیا میں اپنی شاعری کے ذریعے ہندستانی تہذیب و ثقافت کو پہنچوا چکا ہے۔

انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ ہر قوم کی شناخت اس قوم کے شعراسے ہوتی ہے اور ہمیں فخر ہے کہ ہم ہندستانیوں کی شناخت غالب سے ہے۔ انھوں نے غالب کی عظمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہندستان کے کسی بھی خطّے کا فرد ہو وہ اپنی ادبی گفتگو اور تقریر میں غالب کا حوالہ ضرور دیتا ہے۔ اس سے پہلے مزارِ غالب پر گل پوشی اور فاتحہ خوانی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر بدر دُریز احمد، شاہد ماہلی، ڈاکٹر خلیق انجم، گلزار دہلوی، کمال احمد صدیقی، پروفیسر اسلم آزاد، پروفیسر شریف حسین قاسمی کے علاوہ دیگر اربابِ علم و دانش موجود تھے۔ تقاریر کے بعد ایک طرحی مشاعرہ غالب کی زمین میں منعقد کیا گیا جس میں زبیر رضوی، ابرار کرت پوری، ماجد دیوبندی، شکیل شمسی، ابوالفیض سحر، مخمور سعیدی، وارث کرمانی، گلزار دہلوی، صادق، عارف رستوگی اور شاہد ماہلی کے علاوہ دلی اور اطراف دہلی کے مشہور شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(راشٹریہ سہارا دہلی)

گورنمنٹ ویمنس پی جی کالج رام پور میں آل احمد سرور پر یک روزہ سیمینار

● رام پور۔ گورنمنٹ ویمنس پی جی کالج رام پور میں "آل احمد سرور: شخصیت، شاعری اور دانشوری" کے موضوع پر 21، فروری 2002 کو ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں سرور صاحب کی شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں پر نو مقالات پڑھے گئے اور ان سبھی مقالات سے سرور صاحب کی زندگی کے مختلف پہلو روشن ہوئے۔ اس سیمینار کی نوعیت منفرد اس لیے تھی کہ سبھی مقالات طالبات نے پیش کیے جن پر بعد میں مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی، جناب اظہر عنایتی، ڈاکٹر حسن احمد نظامی، جناب خلیل خاں کاشمیری، ڈاکٹر محمد محسن اور سعادت علی خاں صاحبان نے اظہار خیال کیا۔ پہلا مقالہ شعبۂ اُردو کی تنظیم "بزمِ ادب" کی صدر افشاں جاوید نے پڑھا۔ افروز جہاں، ارم فاطمہ، سمیہ اقبال، فائزہ شمس، ارجمند مشہود، گلشن، گلفشاں حسین اور صبا مخدوم نے اپنے مقالات میں آلِ احمد سرور کی شاعری، تنقید اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے مقالے پیش کیے۔ کالج کی پرنسپل اور صدرِ جلسہ ڈاکٹر رنا سہار یہ صاحبہ نے آلِ احمد سرور کی زندگی اور ان کے علمی وادبی کارناموں کا ذکر کیا اور یہ کہا کہ ان کے انتقال سے ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی نے فرمایا کہ طالبات کی جانب سے پیش کیے گئے سبھی مقالے بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں جو سرور صاحب کے گوناگوں جہات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی نے سرور صاحب کی ذاتی زندگی کے مختلف گوشوں، اُن کی علمی بصیرت اور اپنے ذاتی روابط پر بھی روشنی ڈالی۔ اس سیمینار میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے بھی اظہار خیال کیا۔ مشہور شاعر اظہر عنایتی نے سرور صاحب کے سانحۂ ارتحال پر دو نظمیں پڑھیں جن کے اشعار بے حد پسند کیے گئے۔

اس سمینار میں ڈاکٹر محمد محسن، صدر شعبۂ فارسی؛ مشہور مزاح نگار خلیل خاں کاشمیری اور جناب سعادت علی خاں نے بھی سرور صاحب کے انتقال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ سمینار کے اختتام پر شعبے کے اُستاد ڈاکٹر شہزاد انجم نے سمینار کی غرض و غائت پر روشنی ڈالتے ہوئے سبھی مہمانان، پرنسپل کالج اور طالبات کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مسلم یونی ورسٹی میں جلسہ تقسیم اسناد

● علی گڑھ، 26/ فروری۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تقسیم اسناد کا سالانہ جلسہ روایتی جوش و خروش کے ساتھ آج منعقد ہوا۔

مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے سابق وزیر اعظم مسٹر اندر کمار گجرال نے خطبہ اسناد پیش کیا جبکہ وائس چانسلر مسٹر محمد حامد انصاری نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس جلسے کی صدارت پرو چانسلر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے کی۔

یونی ورسٹی کے شعبۂ رابطہ عامہ کی ایک پریس ریلیز کے مطابق ممتاز سائنس داں پروفیسر سی این آر راؤ، مشہور فلم اداکار یوسف خان (دلیپ کمار) اور ممتاز اردو اسکالر مسٹر شمس الرحمان فاروقی کو ڈی ایس سی اور ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر راؤ اور دلیپ کمار کو ان کی غیر موجودگی میں اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔ ڈاکٹر فیروز احمد (بوٹنی) اور پروفیسر کے سی سنگھل (فارماکولوجی) کو ڈی ایس سی کی ڈگریاں تفویض کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی 62 محققین کو پی ایچ ڈی اور 931 طلبہ و طالبات کو ماسٹرس اور 1615 طلبہ و طالبات کو گریجویٹ ڈگریاں تفویض کی گئیں۔ امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے والے 25 طالب علموں کو طلائی اور 105 طالب علموں کو نقرئی تمغے بھی پیش کیے گئے۔

تقسیم اسناد کا خطبہ دیتے ہوئے ہندستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر اندر کمار گجرال نے ہندستان کی خارجہ پالیسی پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندستان کے لیے سب سے اچھا راستہ یہی ہے کہ تمام بڑے ممالک اور خاص طور سے سارک ممالک آپسی رشتوں کو اور بہتر بنائیں۔ ساتھ ہی ہندستان اور پاکستان کے حکمرانوں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمسایہ ملکوں کے اقتصادی اور سیکورٹی سے متعلق مفادات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ایسا کرنا چاہیے۔

سابق وزیر اعظم نے کہا کہ "تہذیبوں کے تصادم" جیسے کھوکھلے نعرے اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ کچھ لوگ اور ملک دوسروں پر اپنی برتری قائم کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان میں ہی نہیں پوری دنیا میں خیر سگالی کے ماحول کو بنائے رکھنے میں اس ملک نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور اس ملک میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے لوگ آباد ہیں اور کثرت میں وحدت کا تصور یہاں ایک مثال ہے۔ مسٹر اندر کمار گجرال نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جیسے عظیم ادارے میں خارجی اور داخلی چیلنج کا مقابلہ کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ ہندستان کا مستقبل نوجوان نسل پر منحصر ہے اور اس ادارے نے جدید ہندستان کی تاریخ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔

مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر محمد حامد انصاری نے سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھیں خوشی ہے کہ یہ ادارہ پوری مستعدی کے ساتھ اپنی ذمّے داریوں کو انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یونی ورسٹی کے تعلیمی نصاب کو ملک کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کیا گیا ہے تاکہ طلبہ کی علمی استعداد میں اضافہ ہو سکے۔

یونی ورسٹی کے رجسٹرار ایس ایم افضل اور کنٹرولر امتحانات پروفیسر سید مہدی عباس رضوی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر رضوی نے تمغہ حاصل کرنے والے طلبہ کے ناموں کا اعلان کیا۔ یونی ورسٹی خازن نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے بھی شرکت کی۔ تقسیم اسناد کا یہ جلسہ 16 سال کی مدت کے بعد منعقد کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا دہلی)

کمپیوٹر کیلی گرافی ٹریننگ سنٹر کا جلسہ تقسیم اسناد

● گلبرگہ۔ انجمن ترقی اُردو ہند (شاخ) گلبرگہ میں قائم قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کمپیوٹر کیلی گرافی ٹریننگ سنٹر کا جلسہ تقسیم اسناد و تہنیت 12/ فروری 2002 خواجہ بندہ نوازؒ ایوانِ اُردو میں منعقد ہوا۔ جلسے کا آغاز ڈاکٹر عبدالحمید اکبر کی قرأتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس جلسے میں برلا کمپنی گروپ کی واسودتہ، سیمنٹ فیکٹری سیڑم کے شری وجئے ین کلکرنی سینئر جنرل منیجر (HRD) مہمانِ خصوصی نے کمپیوٹر تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کمپیوٹر سینٹر کے طلبہ و طالبات سے کہا کہ حال کا طریقۂ تعلیم ماضی کے طریقۂ تعلیم سے یکسر مختلف ہے۔ کمپیوٹر کی تعلیم اور اس کی مکمل معلومات آج ہر نوجوان کے لیے نہ صرف ضروری ہے بلکہ اُس کی زندگی کا اہم جز بھی بن گئی ہے۔ جنوبی ہند کے مشہور صنعت کار جناب فاروق ابا قاسم (سنڈیکیٹ ممبر گلبرگہ یونی ورسٹی) نے بھی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے NCPUL کے تحت چلائے جانے والے کمپیوٹر کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر کے طلبہ و طالبات کی امتیازی کامیابی پر انھیں مبارکباد دیتے ہوئے روشن مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی۔

امجد جاوید چیئرمین مانیٹرنگ کمپیوٹر سینٹر نے پچھلے دو سال کی کارکردگی

کا جائزہ پیش کیا اور سالِ رواں کی تعلیمی کارکردگی کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ جہاں انجمن ترقی اُردو گلبرگہ کی جستجو اور محنت اس کی ترقی کا سبب ہے وہیں NCPUL کے ڈائرکٹر جناب محمد حمید اللہ بھٹ صاحب کے تعاون، مالی اعانت، بروقت رہبری اور شخصی دلچسپی بھی اس کی ترقی میں شامل ہے۔ کمپیوٹر سینٹر کے سپروائزر اور فیکلٹیز کی کوششوں کو بھی سراہا گیا۔

اس جلسے میں گلبرگہ یونی ورسٹی کے نومنتخب ممبران اور جناب وہاب عندلیب صاحب کو کرناٹک اُردو اکادمی کا صدر نامزد کیے جانے کی خوشی میں کمپیوٹر سینٹر کی جانب سے ان کی خدمت میں گل ہائے عقیدت پیش کیے گئے۔ سبھی مقررین نے کمپیوٹر سینٹر کی دن دونی رات چوگنی ترقی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ صدر انجمن جناب محمد عبدالعظیم (سنڈیکیٹ ممبر) نے اپنے خطاب میں طلبہ و طالبات کو مبارکباد دیتے ہوئے آج کی مسابقتی دنیا میں خود کو تیار کرنے کی تلقین کی۔ پروفیسر محمد ہاشم علی صاحب نے جلسے کی صدارت فرمائی اور کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔

انجمن ترقی اُردو کے نائب صدر جناب ڈاکٹر جلیل تنویر نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ طالبِ علم کمپیوٹر سینٹر محمد عبدالمعبود نے بارگاہِ رب العزت میں حمد کا نذرانہ پیش کیا اور جلسے کی کارروائی خازن جناب ولی احمد نے بحسن و خوبی چلائی۔ سینٹر سپروائزر جناب محمد ظہیر احمد خاں نے بحیثیت امتیاز کامیاب طلبہ و طالبات کے ناموں کا اعلان کیا۔ موجود مہمانوں نے اسناد پیش کیں۔ پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے طالبِ علم محمد بشیر اعجاز اور فاطمہ فردوس تھے جنھوں نے یکساں نمبر حاصل کیے ہیں۔ اُنھیں سند کے ساتھ ممنٹو پیش کیا گیا۔ چیئرمین امجد جاوید کے شکریے پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

(ڈاک سے)

کل ہند علامہ اقبال [illegible]

● نئی دہلی، 13/ فروری۔ علامہ اقبال ادبی مرکز، بھوپال کے زیرِ اہتمام منعقدہ کل ہند علامہ اقبال انٹر یونی ورسٹی کوئز میں دہلی یونی ورسٹی نے اوّل مقام حاصل کیا ہے۔ دہلی یونی ورسٹی کی جانب سے شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر مسٹر شمیم احمد اور ایم اے (فائنل) کے طالبِ علم علی احمد ادریسی نے اس کوئز میں شرکت کی تھی۔

یہ کوئز مقابلہ 9/ فروری کو بھارت بھون "بھوپال" میں منعقد کیا گیا تھا جس میں شمالی ہند اور مدھیہ پردیش کی 9 یونی ورسٹیوں نے حصہ لیا تھا۔ جلسے کی صدارت برکت اللہ یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر مسٹر کے ایس ڈھلن نے کی۔ انھوں نے شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی کی تعریف کرتے ہوئے شمیم احمد اور علی احمد ادریسی کو خصوصی مبارکباد پیش کی۔

علامہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکری جہات کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل اس کوئز میں پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر خالد محمود، محمد شمیم اور مرکز بھوپال کے سکریٹری مسٹر آفاق احمد نے جج کے فرائض انجام دیے۔

(قومی آواز، دہلی)

آندھرا پردیش اردو اکادمی — بورڈ آف گورنرس کا اجلاس

● حیدرآباد، 8/ فروری۔ اردو اساتذہ کے تقررات میں حائل روسٹر سسٹم کی دشواری کو ختم کرنے کے لیے کابینی فیصلہ لے کر، اردو اساتذہ کے تقررات کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ وزیر بلدی نظم و نسق و اقلیتی بہبود، اوقاف جناب این محمد فاروق نے آج اردو اکادمی آندھرا پردیش کے بورڈ آف گورنرس کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ تیقن دیا۔ انھوں نے کہا کہ روسٹر سسٹم کو دستوری تحفظ حاصل ہے، اس لیے اسے ختم نہیں کیا جاسکتا، لیکن وہ کابینی منظوری حاصل کرتے ہوئے اردو اساتذہ کے تقررات کی حد تک اس سسٹم کے نفاذ سے استثنیٰ حاصل کریں گے۔ انھوں نے اردو اکادمی کی اسکیموں اور اس کی کارکردگی کی ستائش کی اور کہا کہ وہ، اردو اکیڈمی کی کمپیوٹر ٹریننگ کی اسکیم کو جاری رکھنے میں حائل دشواریوں کو دور کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی کی جانب سے جاریہ 16 مراکز کے ذریعے 3,599 طلبہ و طالبات کو ہر سال ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن کورس کی تربیت فراہم کی جارہی ہے، جس میں بورڈ آف ٹکنیکل ایجوکیشن کے پیکیجز کے علاوہ اردو ڈی ٹی پی سسٹم کی تربیت بھی شامل ہے۔ جناب محمد فاروق نے اردو گھروں کی اسکیم میں اصلاحات، اردو اوپن اسکول، انفراسٹرکچر سہولتوں کی فراہمی، اقلیتی اداروں کے لیے گرانٹ ان ایڈ کی اسکیم، اسکالرشپس وغیرہ میں مزید بہتری لانے اور ان اسکیموں کی اکادمی کے ذریعے راست عمل آوری کو یقینی بنانے کا تیقن دیا۔ انھوں نے گرانٹ میں اضافہ کروانے کی بھی کوشش کرنے کا یقین دلایا۔ صدر اردو اکادمی جناب سید شاہ نورالحق قادری ایڈوکیٹ نے سالِ گزشتہ کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور اردو اکادمیوں کی کل ہند کانفرنس کے موقع پر دیے جانے والے 5 کل ہند ایوارڈس کا اعلان بھی کیا۔

انھوں نے تمام اسکیموں کے تعلق سے ارکان کے سوالات اور شکایتوں کا جواب دیا اور واضح الفاظ میں ساری اسکیموں کی عمل آوری اور ان کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی۔ قبل ازیں ڈائرکٹر/ سکریٹری جناب محمد صدیق نے ارکان کا

خیر مقدم کیا اور گزشتہ اجلاس کی روئیداد پیش کی جس کی ارکان نے توثیق کردی۔ انھوں نے یکم اپریل 2001 تا جنوری 2002 کے مصارف بھی پیش کیے جو 3 کروڑ، 65 لاکھ، 68 ہزار 292 روپے پر مشتمل تھے۔ ارکان نے تمام مدات پر سیر حاصل بحث کے بعد انھیں منظور کرلیا۔ جناب رحیم اللہ خاں نیازی نے، وزیر بلدی نظم و نسق سے 200 اوپن اسکول قائم کرنے، اسکالر شپس کے لیے ایک کروڑ روپے جاری کروانے اور گرانٹ میں اضافہ کرنے کی اپیل کی۔ انھوں نے اردو خبر رساں ایجنسیوں کو کمپیوٹر، فیکس اور ٹیلی فون کی سہولت فراہم کروانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ اجلاس میں 28 میں سے 23 ارکان بورڈ آف گورنرس نے شرکت کی۔ اردو کانفرنس کے موقع پر، عابد علی خاں اور سید لطیف الدین قادری گولڈ میڈلس عطا کرنے کا بھی اعلان کیا گیا۔ عابد علی خاں گولڈ میڈل کے لیے جناب سید جلیل اظہر نمائندہ سیاست، سید لطیف الدین قادری گولڈ میڈل کے لیے جناب سید احمد محی الدین افسر ایڈیٹر اسٹیٹ سماچار کے ناموں کو بورڈ آف گورنرس نے منظوری دی۔

(منصف، حیدرآباد)

حیدرآباد اکادمی کا اجلاس

● حیدرآباد، 14 / فروری۔ حیدرآباد اکادمی کا ایک اجلاس 11 / فروری شام چھے بجے ادارہ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ میں بعنوان ''گفتگو'' اردو کے نامور نقاد، ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار اور سابق صدر شعبۂ اردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور کارگزار وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، پروفیسر شمیم حنفی کے اعزاز میں منعقد ہوا۔ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی سابق صدر شعبۂ اردو، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند مہمانِ خصوصی تھے۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے سابق پروفیسر اور ''اردو ادب'' کے مدیر ڈاکٹر اسلم پرویز بھی بطور مہمان شریک ہوئے۔ حیدرآباد اکادمی کا یہ اجلاس اردو کے مشہور نقاد پروفیسر آل احمد سرور مرحوم کے نام معنون کیا گیا تھا اور شرکا نے انھیں اپنے اپنے طور پر بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ ابتدا میں پروفیسر رحمت یوسف زئی معتمد حیدرآباد اکادمی نے پروفیسر آل احمد سرور کے سانحۂ ارتحال پر قرارداد تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر آل احمد سرور ان چند ماہرین تنقید میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اردو کو نئے تنقیدی رجحانات سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

صدر حیدرآباد اکادمی کے جناب مصحف اقبال توصیفی نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ''گفتگو'' کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم نے سرور صاحب کی ادبی تنقید پر شائع ہونے والی ایک تصنیف کے دیباچے سے چند اقتباسات پیش کیے۔ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے پروفیسر آل احمد سرور سے اپنے دیرینہ تعلقات اور اکتساب فیض کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سرور صاحب آخری لمحات تک مختلف ادبی و تنقیدی موضوعات پر نہ صرف غور کرتے رہے بلکہ اپنے ملنے والوں سے ان پر گفتگو کرتے ہوئے کچھ سوالات بھی اٹھاتے رہے۔ مثلاً کیا آج ادب خواص پسند نہیں ہو رہا ہے اور یہ کہ کیا ادب عام آدمی سے دور نہیں ہو رہا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے سرور صاحب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ تنقید سیاست، مذہب اور اخلاق سے فیض یاب تو ہو سکتی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں نے تمام اعتبارات کو ایک طرح سے منہدم کردیا ہے۔ انھوں نے صارفیت، شہری زندگی کی گھٹن اور حیاتِ انسانی پر ٹیکنالوجی کے حاوی ہونے پر تشویش کا اظہار کیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ایسی صورت حال سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات میں تخلیق کار کے لیے اپنی تخلیقات میں پہلی سی توانائی برقرار رکھنے کے عمل کو ایک ایسا چیلنج بتایا جو ہر زبان اور ملک کے تخلیق کار کو درپیش ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج کا ادب خواص کے علاوہ عام قاری کی فکر و فہم سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے لکھنے والے عصری تنقیدی رجحانات سے مرعوب ہیں۔ پروفیسر انور معظم نے اردو تنقید پر مغربی نظریات اور تنقیدی اصطلاحات کے حاوی ہونے کو نامناسب قرار دیتے ہوئے مشرقی تنقیدی رویے پر زور دیا۔ پروفیسر یوسف کمال نے کہا کہ اردو کے اپنے ادبی کلچر کی بازیافت ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم انگریزی کے سیلاب کا مقابلہ کریں اور اپنی زبان کو تقویت دیں۔ اس محفل میں شریک اردو کی معروف، افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ تخلیق اور تنقید کو ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ایسی تنقید بے مصرف ہے جس کا اپنے دور کی تخلیقات سے کوئی سروکار نہ ہو۔ جناب قدیر زماں نے اس موقعے پر ہندی اور ملیالم کے افسانہ نگاروں بھونیشور اور وائکم بشیر کے حوالے سے کہا کہ ان کی انگریزی میں ترجمہ شدہ کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ایسا نہیں لگتا کہ یہ کہانیاں انگریزی زبان میں نہیں لکھی گئی ہیں حالاں کہ ان کی فضا بھی ہندستانی ہے۔ اس طرح یہ کلیہ باطل ٹھہرتا ہے کہ ہماری زبان کے کچھ بنیادی اصول ہوں جن کا رنگ مقامی ہو۔ ساہتیہ سنگم کے سکریٹری جناب مرلی دھر شرما نے رگ وید کے ایک اشلوک کے حوالے سے نقادوں کو مشورہ دیا کہ وہ گروہ بندی کے شکار ہونے کی بجائے تخلیق کا ہمدردی اور اپنائیت سے جائزہ لیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس اجلاس

میں پروفیسر آل احمد سرور کے تنقیدی نظریات پر بات کرتے ہوئے کہا کہ نقاد ادبی تحقیق پر لکھتے ہوئے اپنے ادبی تصورات کو پیش کرتے اور اس طرح ادیب کے تحقیقی رویے پر غالب آجاتے ہیں۔ اس عمل میں تحقیق کو نظر انداز کیا جاتا ہے جو نامناسب ہے۔ سید خالد قادری نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جہاں ادب کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی جڑیں اپنی مٹی میں پیوست ہوں وہیں آج تنقید میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم نے علوم سے جو زیادہ تر مغربی ہیں، فیض اٹھائیں۔ اگر ہم اپنے عہد اور اپنی زبان کی کھڑکیاں بند کریں گے تو اس میں ہمارا ہی نقصان ہوگا اور ہمارا ادب گھٹن کا شکار ہو جائے گا۔ اس اجلاس کی کارروائی پروفیسر رحمت یوسف زئی نے چلائی۔ تنقید کے موضوع پر شرکا کی کافی طویل گفتگو کے اختتام کے بعد پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی غزل پیش کرکے داد و تحسین حاصل کی۔ جناب اعجاز عبید، رکن عاملہ حیدرآباد اکادمی نے پروفیسر شمیم حنفی سے اپنے تعلق خاطر کا ذکر کرتے ہوئے گفتگو کے شرکا، مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

(منصف، حیدرآباد)

نظام کالج میں "اردو ادب کی تاریخ" پر ورکشاپ

● حیدرآباد، 12 فروری۔ نظام کالج کی یہ تاریخی اہمیت رہی کہ یہاں سے اردو کے بڑے نامور محقق اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد کا تعلق رہا ہے، جنھوں نے یہاں سے تعلیم حاصل کی اور ملک کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ مجھے اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ میں ایسے تاریخی کالج کا پرنسپل ہوں۔ پروفیسر اوما میشور ریڈی، پرنسپل نظام کالج نے ان خیالات کا اظہار NCERT کے زیر اہتمام ورکشاپ "اردو ادب کی تاریخ برائے اعلیٰ ثانوی درجات" کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ شعبۂ اردو نظام کالج کے صدر جناب ایس اے شکور کی اعلیٰ اور فعال علمی شخصیت کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ این سی ای آر ٹی دہلی نے اس ورکشاپ کو منعقد کرنے کے لیے نظام کالج کو منتخب کیا۔ قبل ازیں نامور محقق پروفیسر آل احمد سرور کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی قرارداد پیش کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ پروفیسر آل احمد سرور ایک اعلیٰ پایے کے محقق، نقاد اور بین الاقوامی سطح کے پروفیسر تھے۔ وہ تدریسی اصولوں کے ماہر تھے۔ وہ تاریخ اردو ادب اور تنقید کے ماہر ہونے کے باوصف ایک بین الاقوامی سطح کے مصنف بھی رہے۔ نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا انتقال اردو ادب کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ صدر نشین اردو اکادمی سید شاہ نورالحق قادری نے اپنی تقریر میں اردو اکیڈمی کی جانب سے چھٹی، نویں اور گیارھویں جماعتوں کی نصابی کتب کی اشاعت کا ذکر کیا اور این سی ای آر ٹی کے ارباب مجاز سے خواہش کی کہ وہ دکنی کو بھی نصاب میں شامل کریں۔

ڈائرکٹر ورکشاپ و صدر شعبۂ اردو نظام کالج جناب ایس اے شکور نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں ورکشاپ کی اہمیت اور افادیت کا تفصیلی جائزہ لیا اور نصاب میں شامل تاریخ ادب کے اہم واقعات کو مکمل تحقیق اور پورے شعور کے ساتھ نصاب میں شامل کرنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے صدر اردو اکادمی آندھرا پردیش سے اپنی تقریر کے دوران خواہش کی کہ وہ طلبہ میں اسکالرشپس اور ایوارڈز دینے کے علاوہ اردو طلبہ کے معیار کو بلند کرنے پر زیادہ زور دیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں اردو میڈیم کی تمام نصابی کتابوں کی اشاعت میں اردو اسکالرس کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے استفادہ کرنے کی خواہش کی۔ پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبۂ اردو آرٹس کالج نے طلبہ کے نصاب میں شامل ضخیم کتابوں کے بوجھ کو کم کرنے اور اس کام کی دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کتابوں کی آسان ترتیب پر زور دیا۔ صفدر نقوی نے کہا کہ یہ کام محنت چاہتا ہے، اس کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد ہی اس ذمے داری کو انجام دے سکتے ہیں۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ تاریخ ایک نازک مسئلہ ہے۔ اس کو مرتب کرنا نہایت دشوار کام ہے۔ ہر عمر کے افراد کے لیے تاریخ کی ایسی کتابیں این سی ای آر ٹی کو شائع کرنی چاہئیں جو ان کے ذوق اور معیار کو بلند رکھے اور اس ذمے داری کو پورا کرنا بھی ان کے مقاصد میں شامل ہونا چاہیے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ مستقبل میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ تقریب کے اختتام پر ایس اے شکور نے مہمان خصوصی، این سی ای آر ٹی کے ارباب مجاز اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(سیاست، حیدرآباد)

ودربھ کے قلمکاروں کی تصانیف، رسائل کی نمائش

● اردو اساتذہ کے یک روزہ تعلیمی سمینار کے موقع پر گزشتہ دنوں محمد یعقوب الرحمان صاحب کے تعاون سے ودربھ کے اہم قلمکاروں کی کتب، رسائل و اخبارات پر مشتمل نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ نمائش کا افتتاح نور پاتوروی نے کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب اختر احمد خاں سول جج نے شرکت فرمائی۔ ودربھ سے نکلنے والے اردو اخبارات رسائل کے لیے ایک گوشہ مخصوص تھا۔

ایوت محل میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی نمائش تھی۔ اساتذہ کی اکثریت نے اعتراف کیا کہ انھیں علم نہیں تھا کہ ودربھ میں بھی اتنے لکھنے والے ہیں۔ جن اردو ادباء و شعراء کی کتابیں اس نمائش میں رکھی گئیں ان کے

اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

ناگپور ضلع کے الحاج عبدالکریم پاریکھ صاحب، ڈاکٹر سید عبدالرحیم، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، طرفہ قریشی، ڈاکٹر محمد اسداللہ، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، ڈاکٹر محمد اشفاق۔ آکولہ ضلع کے مولانا ہادی نقشبندی، راز بالاپوری، ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر شیخ رحمان، فصیح اللہ خاں نقیب، ضمیر ساجد، ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، بلقیس شمیمہ اور جوش ادیب۔ امراوتی ضلع کے خواجہ لطیف احمد جرتی، ذکاءالرحمن صدیقی، ڈاکٹر وسیم دروانہ، قیصر امراوتوی، خلیل الصمدی شارق، حیدر بیابانی، محمد متین احمد، بابو آر۔ کے اور پروفیسر اقبال احمد خاں۔ ایوت محل ضلع کے قاضی سید غیاث الدین، حکیم انوار محمد خاں کامل، سید غلام محمود شاہ، مولانا محمد حبیب الرحمان، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، منصور اعجاز، مخلص مصوری، مہر رحمن، قاضی ہارون علی خان، کیف پوسدوی اور ساحل قلمنوری۔

اردو مدارس سے نکلنے والے اردو میگزین، "مرقع اردو" امراوتی، "بہارستان" بالاپور، "گلشن عزیز" باتور، "صدف" دارودہ کے شمارے بہت پسند کیے گئے۔ اخبار "تاج" کامٹی، "دور جدید نامہ" ناگپور، "قیادت" امراوتی، "فردوس" امراوتی، کمپیوٹر میگزین امراوتی، "مفتاح الجنتہ" بارسی ٹاکلی "العظیم" ایوت محل کے شمارے نمائش میں رکھے گئے تھے۔ (ڈاک سے)

انجمن ترقی اردو انڈال شاخ کے عہدے داروں کا انتخاب

● انجمن ترقی اردو (ہند) مغربی بنگال کی علاقائی انڈال شاخ کی تشکیل کے لیے ایک میٹنگ اتوار 20/جنوری کو ساؤتھ بازار اردو پری پرائمری اسکول انڈال ضلع بردوان میں ماسٹر ابوحیدر پرویز کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کنوینر ماسٹر فیض احمد نے بتایا کہ انجمن ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعے اردو کے مسائل نہ صرف پیش کیے جاتے ہیں بلکہ ان کو عملی طور پر حل کرنے کی بھرپور جدوجہد کی جاتی ہے۔ اس میٹنگ میں اتفاق رائے سے حسب ذیل عہدیداران کا انتخاب انڈال شاخ کے لیے عمل میں آیا:

مولانا عبدالعزیز انور قاسمی (صدر)، ماسٹر فرید خان (نائب صدر)، ماسٹر ابوحیدر پرویز (جنرل سکریٹری)، اشرف حسین سکریٹری، احتشام احمد (سکریٹری)، فیض احمد (سکریٹری)، ماسٹر سیف احمد (خازن)، محمد مشتاق، ظفر امام مہر، محمد مبین خاں، محمد شادات، علی حسین مرتضی، فیروز انصاری، ماسٹر سلیم احمد، عارف عمر، محمد امین الدین اور ماسٹر ایاز احمد (اراکین)۔

(آزاد ہند، کولکاتہ)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مشاعرہ

● نئی دہلی، 18/فروری۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کلچرل کمیٹی کی جانب سے انصاری آڈیٹوریم میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پنڈت گلزار زتشی دہلوی نے کی۔ افتتاح پروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے کیا۔ افتتاحی خطاب میں پروفیسر فاروقی نے آل احمد سرور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی رحلت کو دنیائے ادب کے لیے ایک بڑے خسارے سے تعبیر کیا۔ مشاعروں کی ادبی روایت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے بتایا کہ زندہ قومیں اپنے تہذیبی اداروں کی پرورش و پرداخت صرف تہذیبی شناخت کے لیے ہی نہیں کرتیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی و سربراہی بھی کرتی ہیں۔

وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے اپنی گفتگو میں شعرا کے انتخاب کو پسند کیا۔ مشاعرے کے کنوینر ڈاکٹر خالد محمود نے شعرا اور مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ کی علمی اور تہذیبی زندگی میں مشاعرے بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے انجام دی۔ آخر میں ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر فیضان احمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(قومی آواز، دہلی)

بہار اردو اکادمی کا کل ہند مشاعرہ

● پٹنہ۔ "مشاعرے آج بھی ہماری سماجی زندگی کا اہم حصہ ہیں اور ان کے ذریعے اردو کے پیغام کو دور دور تک پہنچانے میں بہت مدد ملتی ہے۔" ان خیالات کا اظہار ریاست کے وزیر اقلیتی فلاح، بجلی اور قانون، نیز بہار اردو اکادمی کے کارگزار صدر جناب شکیل احمد خاں نے اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ کل ہند مشاعرے کے صدارتی خطبے میں کیا۔

جناب شکیل احمد خاں نے کہا کہ ذرائع ابلاغ میں بہت توسیع ہوئی ہے اس کے باوجود لوگ اتنی تعداد میں مشاعرہ سننے کے لیے آتے ہیں تو اس کا بنیادی سبب اردو زبان اور اردو شاعری کی مقبولیت ہے۔

مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین جناب ہارون رشید نے کہا کہ مشاعرے صرف اردو داں ہی پسند نہیں کرتے بلکہ ایسے اشخاص بھی سننے آتے ہیں جو اردو زبان نہیں جانتے۔ اس سے ان کے اندر اردو سیکھنے کا ذوق اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ناظم مشاعرہ جناب فخرالدین عارفی نے عظیم آباد کے مشاعروں کی صالح قدروں پر روشنی ڈالی۔ جن بیرونی شعرا حضرات نے اپنا کلام سنایا ان کے اسمائے گرامی ہیں: جناب مخمور سعیدی، جوہر کانپوری، عظمہ اختر، شبینا

ادیب، حبیب ہاشمی، سنیل کمار تنگ، شاہد رضوی، فردوس گیاوی، مختار احمد عاصی، وفا ملک پوری، ابھئے کمار بے باک، اویس احمد دوراں اور ناشاد اورنگ آبادی۔ مقامی شعرا میں خورشید اکبر، ظہیر صدیقی، تاج ابدالی، عبدالرب جاوید، قوس صدیقی، انور ایرج، عطا عابدی، ظفر صدیقی، شمیم قاسمی، عالم خورشید، شفیع مشہدی، شکیب ایاز، اسرار جامعی، معصوم شرقی اسیر، حسن نواب حسن، پرویز انجم، محترمہ سازینہ اور محترمہ کوثر علی کوثر نے۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر رضوان احمد نے شعرا حضرات اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

[illegible]

● گذشتہ دنوں افسانہ کلب مالیر کوٹلہ کی ایک نشست دفتر افسانہ کلب میں منعقد ہوئی جس کی صدارت سرکاری کالج مالیر کوٹلہ کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال نے فرمائی۔ اس نشست میں کلب کے تین ممبران نے افسانے پڑھ کر سنائے۔ ارشد فہیم نے "وہ ایک لڑکی"، محمد اختر شاد نے "مہندی والے ہاتھ" اور محمد سالک جمیل نے "میاں مٹھو" افسانے پڑھ کر سنائے جن کو سامعین نے بہت سراہا۔ حاضرین نے ان افسانوں پر خاطر خواہ تنقید کی، نیز اپنے قیمتی مشورے دیے۔

نشست کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال نے افسانہ کلب کی جانب سے افسانوی ادب کے فروغ کے لیے کی جا رہی کاوشوں کو لائق تحسین قرار دیا۔ انھوں نے نوجوان افسانہ نگاروں کو تلقین کی کہ وہ آفاقی اور بین الاقوامی موضوعات کو صفحۂ قرطاس پر لائیں۔ آخر میں کلب کے صدر محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے صاحب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض کلب کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے انجام دیے۔

اس موقعے پر مشہور صحافی "شمع" اور "سشما" کے مدیر ادریس دہلوی، مشہور افسانہ نگار ہرچرن چاولہ، فلمی ادیب و افسانہ نگار انور خاں، نامور ادبی شخصیت اور "شہود" کے مدیر شہود آفاقی، طنز و مزاح کے شاعر رضا نقوی واہی اور افسانہ نگار و شاعر ہیرا نند سوز کے انتقال پر افسوس ظاہر کیا گیا اور تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔ (ڈاک سے)

اردو فاؤنڈیشن کا جلسہ

● نوئیڈہ، 7/مارچ 2002۔ رفعت سروش کی نئی کتاب "پروین رائے اور دوسرے منظوم ڈرامے" پر اردو فاؤنڈیشن کے جلسے میں سب سے پہلے بالغ نظر نقاد اور دانشور پروفیسر آل احمد سرور کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور ان کی رحلت کو اردو کا عظیم نقصان اور ایک اہم دانشورانہ دور کا خاتمہ تصور کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ابوالفیض سحر نے انجام دیے۔ پروفیسر قمر رئیس نے رفعت سروش کی اکتالیسویں کتاب پر اپنی رائے پیش کی اور اس منظوم ڈرامے کا اجرا فرماتے ہوئے کہا کہ "وہ ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں اور اپنے ہم عصروں میں اس لیے امتیازی شان رکھتے ہیں کہ ان کے یہاں گہرا تاریخی شعور ہے جسے وہ اپنی شاعری اور خاص طور پر منظوم ڈراموں میں تخلیقی شان کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ "عروج آدم" کے ڈراموں سے لے کر آج تک مختلف کرداروں کے حوالوں سے انسان کی عظمت ان کا محبوب موضوع ہے۔" اس سے قبل بزرگ افسانہ نگار بلراج ورما کا بھرپور مقالہ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے سنایا۔ ورما صاحب نے کتاب میں شامل سبھی ڈراموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے "خواب اور تعبیر خواب" کو بے حد سراہا اور کہا کہ یہ ہماری زندگی کا منظرنامہ ہے۔

پروفیسر طاہر سید محمود نے رفعت سروش کی شخصیت اور شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے مقالے میں کہا کہ ایک سو چوالیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف النوع تصنیف ہے۔ یہ خواب اور تعبیر خواب، ہماری جنگِ آزادی کے بیسویں صدی والے حصے اور حصول آزادی کے مابعد تناظر پر محیط ہے۔ حق شناس اور درد آشنا شاعر کے قلم سے نکلا ہوا یہ منظوم ڈرامہ آہستہ آہستہ بہنے والے کسی آبشار کی طرح آزادیٔ وطن کی طویل جد و جہد کے ہر قابلِ ذکر سنگِ میل سے گزرتا ہے۔

ابوالفیض سحر نے اس کتاب میں شامل مرتبہ "زرتیہ سولولو کی رقص جاری رہے" پر مضمون پڑھا جو شہر حیدر آباد کی تعمیر اور قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کی داستان پر مبنی ہے۔

رفعت سروش نے مذاکرے میں حصہ لینے والے دانشوروں کا شکریہ ادا کیا اور اپنی تازہ نظم "پتھروں کا شہر" سنائی جو دور حاضر کی بربریت کی صوتی تصویر ہے۔ لندن سے آئے ہوئے مہمان شاعر ڈاکٹر عبدالغفار عزم کا استقبال کیا گیا۔ انھوں نے اپنا کلام سنایا۔ پروفیسر مظفر حنفی نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ عالمی شہرت کے حامل شاعر بیکل اتساہی نے دوہے، غزل اور گیت پیش کیے۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر قمر رئیس نے ازبکستانی شاعر غفور غلام کی ازبک نظم "عظیم ہندستان" کا بے حد خوبصورت منظوم ترجمہ سنایا۔

اردو فاؤنڈیشن کے روح رواں رفعت سروش کے اظہار تشکر کے بعد محفل اختتام پذیر ہوئی۔ (ڈاک سے)

[illegible]

● نئی دہلی، 19/فروری۔ ساہتیہ اکیڈمی کی ایک پریس ریلیز کے مطابق معروف اردو شاعر کیفی اعظمی کو اکیڈمی کے اعلا ترین اعزاز فیلو ساہتیہ

اکادمی سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ اعزاز ادب کے لیے ناقابلِ فراموش خدمت انجام دینے والی قد آور شخصیت کو ہی عطا کیا جاتا ہے اور کسی ایک وقت میں اکیڈمی سے اعزاز یافتہ ان شخصیات کی تعداد 21 سے زیادہ نہیں ہوتی۔

کیفی اعظمی کو یہ اعزاز عمر کے 77 ویں سال میں ملا ہے۔ وہ 23 فروری 1925 اعظم گڑھ ضلع (مقام مجوان) پیدا ہوئے۔ انھوں نے الہ آباد یونی ورسٹی سے منشی کامل اور اعلا قابل کے امتحانات اور لکھنؤ یونی ورسٹی سے دبیر ماہر اور دبیر کامل کے امتحان پاس کیے۔ وہ اردو میں ترقی پسند تحریک کی ایک اہم شخصیت رہے ہیں۔ 1942 میں تحریکِ آزادی سے وابستگی کے بعد انھوں نے کالج چھوڑ دیا۔ 1975 میں ان کو سوویت یونین نے نہرو ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ 1975 میں ان کو ساہتیہ اکیڈمی کا ادبی ایوارڈ ملا۔ 1973 میں حکومتِ ہند نے ان کو پدم شری کا اعزاز عطا کیا۔ ان کے دس سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام جھنکار 1941 میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔ ان کے مجموعے آخرِ شب، آوارہ سجدے اور سرمایہ بہت مقبول ہوئے۔ اکیڈمی نے ہندی ادیب بھیشم ساہنی اور آسامی شاعر نیل منی پھوکن کو بھی فیلو نامزد کیا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ

● نئی دہلی، 18 / فروری۔ ساہتیہ اکادمی کی ایک پریس ریلیز کے مطابق تراجم پر انعامات برائے سال دو ہزار کے لیے اکادمی سے ایگزیکیٹیو بورڈ نے 14 مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم کو چن لیا ہے۔ ان مترجموں کو پندرہ ہزار روپے نقد، ایک شاندار کاپر پلیک اگست میں ایک خصوصی جلسے میں دیا جائے گا۔

جن کتابوں کے تراجم کو چنا گیا ہے ان میں کرشن چندر پر مضامین کا ایک مجموعہ بھی شامل ہے۔ اس کا ترجمہ بنگالی زبان میں تاتی سرنے "کرشن چندر رنرو چتا گلپا" نام سے کیا ہے۔ غالب پر پون کے ورما کی کتاب "غالب۔ دی مین، دی ٹائمس" کا اردو ترجمہ "غالب شخصیت اور عہد" بھی شامل ہے۔ یہ ترجمہ ایم اسامہ فاروقی نے کیا ہے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

خوشحال زیدی، "بیسٹ سٹیزن آف انڈیا" ایوارڈ

● نئی دہلی، 17 / فروری۔ بچوں کے ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ادبِ اطفال کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے والے ڈاکٹر خوشحال زیدی ماضی میں کئی اعزازات سے نوازے جا چکے ہیں۔ کئی ہندی، اردو اور مراٹھی اداروں کے ذریعے ایوارڈ حاصل کرنے والے خوشحال زیدی کو آل انڈیا رائٹرس اینڈ اسٹڈیز کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی مل چکا ہے اور اب ملک کے مختلف شعبوں کی کئی اہم شخصیتوں کے ساتھ "بیسٹ سٹیزن آف انڈیا" اعزاز سے سرفراز کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

تعزیتی جلسے

● نئی دہلی، 12 / فروری۔ اردو کے بزرگ نقاد و دانشور پروفیسر آل احمد سرور کے سانحۂ ارتحال پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 11 / فروری کو ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب شمس الرحمان فاروقی نے فرمائی۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد، صدرِ شعبہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی نے سرور صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی شخصیت اپنے شاگردوں اور ادب کے لیے ایسے قلعے کی مانند تھی جس کے مستحکم سقف و بام نے افراد اور ادب کو مغرب کے ان اثرات سے محفوظ رکھا جو ہندستانی معاشرے اور ادب میں جاری مشرقی اقدار کو گزند پہنچا سکتے تھے۔

صدرِ جلسہ جناب شمس الرحمان فاروقی نے مرحوم سے اپنی گہری قربتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے طرزِ فکر و عمل پر بھرپور روشنی ڈالی اور بتایا کہ سرور صاحب نے کس کس طرح طالبانِ ادب کی ذہنی آبیاری کی اور کیسے کیسے مواقع پر یہ ثابت ہوا کہ تحمل اور عفو و درگزر کی روشنی پر سرور صاحب کے قدم ڈگمگاتے ہی نہ تھے۔

فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین پروفیسر ضیاء الحسن ندوی نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں ایسی شخصیت قرار دیا جس نے اپنی تدریس اور تحریر سے تین نسلوں کی آبیاری کی۔

جلسے میں شعبۂ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور اسلامیات کے متعدد اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طالب علم شریک ہوئے۔ جلسے کے اختتام پر تعزیتی قرارداد پیش کی گئی جس کے بعد دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے جلسہ برخواست ہوا۔ (ڈاک سے)

● الہ آباد۔ اردو کے صفِ اول کے ادیب و ناقد، شاعر اور دانشور پروفیسر آل احمد سرور کی وفات پر شعبۂ اردو الہ آباد یونی ورسٹی کے طلبہ و اساتذہ نے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا جس کی صدارت پروفیسر سید محمد عقیل نے فرمائی۔ ابتداً صدرِ شعبۂ اردو پروفیسر عبدالحامد نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرور صاحب بلاشبہ صفِ اول کے ادیب و ناقد تھے۔ زندگی بھر وہ علم و ادب کے میدان میں سرگرم رہے۔ ان کے کاموں کی فہرست بے حد طویل ہے۔ ڈاکٹر اشفاق حسین نے کہا کہ وہ ادیب و ناقد تو تھے

ہی، شاعر بھی تھے لیکن تنقید میں ان کی جگہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے کہا کہ جس طرح ادب کے چار ستون (منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت) تھے اسی طرح اردو تنقید کے بھی چار ستون (احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین اور آل احمد سرور) تھے۔ افسوس صد افسوس کہ آج چوتھا ستون گر گیا۔ ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد نے کہا کہ ان کے کام مدتوں یاد کیے جائیں گے۔ پروفیسر نفیس امام رضوی نے کہا سرور ان ناقدوں میں سے تھے جن کی شخصیت بڑی ہمہ جہت تھی۔ انھیں اقبالیات سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ صدر جلسہ پروفیسر سید محمد عقیل نے احتشام حسین کے توسط سے اپنی پرانی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک زمانے میں جب احتشام حسین اور آل احمد سرور لکھنؤ میں تھے تو ایسا لگتا تھا کہ پورا ہندستان لکھنؤ میں سمٹ آیا ہے۔ انھوں نے ایک نہیں، دو تین نسلوں کی آبیاری کی۔

آخر میں ایک تعزیتی قرارداد پیش کی گئی جس میں ان کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی اور پس ماندگان کو صبر کی تلقین کی گئی۔ (ڈاک سے)

● ممبئی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے 2/مارچ 2002 کی شام اکادمی کے دفتر میں پروفیسر آل احمد سرور مرحوم کی یاد میں تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی، ڈاکٹر صاحب علی اور قمر قادری نے اپنے تاثرات پیش کیے اور اکادمی کی جانب سے تعزیتی قرارداد پیش کی گئی۔ (ڈاک سے)

● مالیگاؤں۔ "اردو زبان و ادب کا اپنا مزاج ہے اور آل احمد سرور اردو ادب کے ایک ایسے ناقد تھے جن کی تنقید ہمارے مزاج کے عین مطابق تھی۔ یہ کلمات پروفیسر عبدالحفیظ انصاری (صدر انجمن ترقی اردو، مالیگاؤں) نے مرحوم آل احمد سرور کو یاد کرتے ہوئے کہے۔ مدیر توازن، عتیق احمد عتیق نے کہا کہ اردو تنقید نگاری جو تعریف آل احمد سرور صاحب نے کی ہے وہ بے مثال ہے۔ شعبۂ اردو فارسی ایم ایس جی کالج کے صدر ڈاکٹر اشفاق انجم نے کہا کہ بلاشبہ تین نسلوں نے سرور صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ مدیر بنفشہ [illegible] نے کہا کہ اردو تحریک سے ان کی گہری وابستگی تھی وہ بڑے بااصول اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر امان اللہ خاں صاحب نے سرور صاحب کی تنقید کو دوسری بڑی زبانوں کی تنقید کے ہم پلہ قرار دیا۔ جناب اسحٰق خضر نے کہا کہ انھوں نے ادیبوں اور نقادوں کی بہتر ڈھنگ سے رہنمائی فرمائی ہے۔ احمد عثمانی نے کہا کہ مرحوم کی تنقید میں بڑی شگفتگی اور تازگی پائی جاتی ہے اور یہ بات انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ خیال انصاری (جنرل سکریٹری انجمن، مدیر خیر اندیش) نے تجویز تعزیت پیش کی۔

ناسک ضلع اردو پترکار سنگھ کے آفس میں منعقدہ اس تعزیتی مجلس میں ایم یوسف انصاری، شاعر بدرالدین بادل، نظیر احمد نظیر، جاوید آفاق، رفیق مومن اور احتشام انصاری نے بھی شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● 11/فروری کو 4 بجے شام میں پروفیسر آل احمد سرور کے انتقال پر پروفیسر خورشید جہاں، صدر شعبۂ اردو دونو بابھاوے یونیورسٹی کے یہاں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد ہوا جس میں شہر کے ممتاز ادبا و شعرا نے شرکت کی۔ اردو کے شاعر اور ناقد ظہیر غازی پوری کی صدارت میں کارروائی شروع کی گئی۔ ابتدا میں پروفیسر خورشید جہاں نے آل احمد سرور کی مختلف فنی جہات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر جلیل اشرف نے بتلایا کہ "سرور صاحب نے جس دلسوزی اور احساس ذمے داری کے ساتھ نوجوان ذہنوں کی پرورش کی ہے اس پر ہماری آئندہ نسلیں فخر کرتی رہیں گی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خالد اقبال، صابر حسین صاحب، محمد نسیم احمد، بشیر اقبال اور محمد عامر نے بھی اظہار خیال کیا۔

(ڈاک سے)

● رانچی۔ اردو کے بزرگ ترین نقاد پروفیسر آل احمد سرور کے انتقال پر انجمن ترقی اردو اور حلقہ ادب بہار کھنڈ کی جانب سے مورخہ 13/فروری کو دفتر انجمن میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر ابوذر عثمانی، صدر انجمن و حلقہ ادب نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر وکیل احمد رضوی سکریٹری حلقہ ادب نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

اس موقعے پر رانچی کے معروف ادبی شخصیتوں، دانشوروں اور زبان و ادب کے شیدائیوں نے پروفیسر آل احمد سرور کی علمی، تعلیمی، لسانی، ادبی اور تنقیدی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر جمشید قمر، قیصر زماں، قمر حمید، قمر الزماں قمر، سمیع اللہ شفق، ذبیح اللہ شمسی، اصغر مصباحی، شریف احسن مظہری، وکیل رضوی، قمر احسن اور عبدالسلام راجن نے سرور صاحب کی ادبی فکر اور نظریے سے چند اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی۔ پروفیسر ایچ آر نعمانی نے سرور صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کا سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے پر زور دیا۔ نشست کے اختتام پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● حیدرآباد۔ غالب اکادمی نئی دہلی میں خطاطی و گرافک ڈیزائن ٹریننگ کے سینئر انسٹرکٹر جناب انیس صدیقی 16/فروری 2002 کو NCPUL کی جانب سے ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد تشریف لائے اور انسٹرکٹرز جناب محمد عبدالغفار اور جناب رضی الدین اقبال کے ہمراہ خطاطی و گرافک

ڈیزائن سینٹر کا تفصیلی معائنہ کیا۔ طلبہ و طالبات کی عملی مشق دیکھی اور اپنے تجربات و مشاہدات طالب علموں کے سامنے پیش کیے۔ انھوں نے کمپیوٹر سینٹر کا بھی جائزہ لیا۔ جناب جعفر جری سپر وائزر، فیکلٹی مس انورادھا اور جناب اکبر علی خاں اور پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو سے بھی انھوں نے تبادلہ خیال کیا اور سنٹرز کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے شہروں میں اس طرز کے مراکز کے لیے ادارۂ ادبیات کو مثالی مرکز قرار دیا۔

● دہلی ادارۂ ادب اسلامی دہلی کے زیر اہتمام ماہانہ ادبی نشست، دفتر ماہنامہ "پیش رفت" بلیماران دہلی میں 3/مارچ کو شام 4 بجے منعقد ہوئی جس کی صدارت معتبر شاعر جناب نظمی سکندر آبادی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب عزیز بگھروی نے انجام دیے۔ ابتدا میں رکن ادارہ جناب انتظار نعیم صاحب نے گجرات کے پرتشدد فرقہ وارانہ فسادات پر اظہار تاسف کرتے ہوئے مذمتی قرارداد پیش کی جس کی تمام شرکا نے تائید کی۔

شعری نشست کا آغاز جناب ناشر کاظمی امروہوی کی حمد پاک سے ہوا۔ جن شعرا نے اپنا منتخب کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں: نظمی سکندر آبادی، تمر سنبھلی، انتظار نعیم، ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، عاطر سنبھلی، ناشر کاظمی امروہوی، عرفان احمد عرفان، شفیق دہلوی، عزیز بگھروی۔

● بھوپال۔ گذشتہ دنوں دہلی میں منعقدہ بین الاقوامی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے اردو ٹرسٹ لندن کے صدر ڈاکٹر عبدالغفار عزم ہندستان آئے۔ سیمینار کے بعد وہ بھوپال میں اقبال بیدار کے مہمان رہے۔ اسی دوران بھارت بھون کی 25ویں سالگرہ پر کئی مشہور کوی، ادیب و شاعر بھوپال آئے جن میں ڈاکٹر مظفر حنفی بھی شامل تھے۔

بزم ڈاکٹر اقبال نے ہر دو حضرات کے لیے ایک اعزازی ادبی محفل آراستہ کی۔ عزم صاحب کی صدارت اور عشرت قادری کی نظامت میں یہ بزم سخن نو بجے شب تا بارہ بجے شب نہایت کامیاب رہی۔ ڈاکٹر عزم اور ڈاکٹر مظفر حنفی سے کئی غزلیں سنی گئیں جبکہ دیگر شعرا میں عشرت قادری، رضا رامپوری، ارمان اکبر آبادی، رہبر جونپوری، پروفیسر مختار شمیم، اقبال بیدار اور عزیز روشن نے اپنے کلام سے نوازا۔ پروفیسر آفاق احمد سے ان کا کلام سنا گیا۔ قبل مشاعرہ طنز نگار مصطفےٰ تاج نے ایک انشائیہ "اب میں کیا کروں" اور محترمہ رضیہ حامد نے مضمون "اقبال بیدار میری نظر میں" سنا کر داد حاصل کی۔

● ٹونک، 17/فروری۔ انڈین مائنورٹی اینڈ میجارٹی یتھ کمیٹی ٹونک (IMMYC) کی جانب سے، اس کمیٹی کے سرپرست خاص جناب عبدالسلیم ساحلی، صدر جناب کاشف علی اور نائب صدر جناب احمد علی کی زیر نگرانی ایک شاندار شام کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی جناب دوارکا پرساد بیروا، ضلع پرکھ، ٹونک، صدر جناب حاجی محمد اجمل، چیئرمین نگر پریشد، ٹونک، خصوصی مہمان کی حیثیت سے جناب اے اے شہزاد، صدر ضلع بلاک کانگریس کمیٹی ٹونک بھی مسند پر تشریف فرما تھے۔ تقریب کی نظامت جناب معقوم احمد ندیم نے کی۔

اس تقریب میں جناب دوارکا پرساد بیروا اور جناب حاجی محمد اجمل اور دیگر 50 حضرات کو ان کے کارہائے نمایاں کے لیے یادگاری تمغہ، ٹرافی اور سپاس نامہ پیش کر کے ان کا اعزاز کیا گیا۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے کمپیوٹر سینٹر جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے چلایا جا رہا ہے، کے انچارج ڈاکٹر محمد ریاض الدین خاں کا نام بھی شامل ہے۔

ضلع پرکھ، مہمان خصوصی نے اس اس یادگار شام کے انعقاد کے لیے آئی۔ ایم۔ وائی۔ سی کے رضاکاروں اور اراکین کو مبارک باد دی اور موجودہ حالات میں اس طرح کی تنظیموں کی اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے اعزاز یافتہ شخصیات کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر ایک کلچرل پروگرام بھی پیش کیا گیا جس میں تھک رقص کلاکار جناب صابر بھائی، غزل گایک جناب رشید میاں، بھجن کلاکار جناب ناصر میاں، چار بیت فنکار استاد منصور اور پارٹی، بانسری وادک جناب محمد شریف ماسٹر کے علاوہ خاموش کلاکار جناب ظفر نے اپنی کلا اور رچناؤں کو پراثر انداز میں پیش کیا۔

رسم اجرا

مٹی مٹی میر ادل

● "مٹی مٹی میرا دل" پروفیسر مغنی تبسم کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے جو 1991 میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، دوبارہ اکتوبر 2001 میں پندرہ غزلوں کے اضافے کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس نام سے ہندی رسم خط میں ترتیب و تہذیب جناب ششی نارائن سوادھین نے کی ہے۔ 8/مارچ 2002 کو اردو ہال، حمایت نگر میں پروفیسر شیو کے کمار سابق وائس چانسلر سنٹرل یونی ورسٹی حیدر آباد کے ہاتھوں اس مجموعے کی رسم اجرا انجام پائی۔ رسم اجرا کے بعد اپنی تقریر میں پروفیسر شیو کے کمار نے فرمایا کہ موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کے لیے اردو ہندی زبانوں کے شاعروں کے مجموعوں کو دونوں زبانوں میں شائع کر کے امن و شانتی کی فضا کو بحال کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ اس تقریب میں میں سہ لسانی فارمولے کو عملی جامہ پہنتے دیکھ رہا ہوں۔ اردو کے شاعر کو ہندی والوں نے اپنایا اور انگریزی کے پروفیسر نے

نقاب کشائی انجام دی۔ ابتدا میں جناب نصرت محی الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے تعارفی نوٹ پیش کیا۔ کشمیر یونی ورسٹی کے پروفیسر وی وی کچرو نے "منی منی میرا دل" کے اشعار کے تعلق سے بتایا کہ یہ قارئین کو سلاتے نہیں بلکہ جگائے رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر درگیش نندنی اسوسی ایٹ پروفیسر عثمانیہ یونی ورسٹی، ڈاکٹر ریکھا شرما ہندی ڈپارٹمنٹ وی وی کالج، محترمہ انیس پروین، مرتب جناب ششی نارائن سواد صین اور پروفیسر چکرورتی نے بھی جلسے سے خطاب فرمایا۔

پروفیسر مغنی تبسم نے اپنی ہندی کتاب کی اشاعت پر تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ دیوناگری میں اردو شاعر کے کلام کو پسند کیا گیا یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ سواد صین نے اس کتاب کی عمدہ ترتیب اور اشاعت کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچایا۔ نصرت محی الدین کی ان تھک کوششیں بھی شکریہ کی مستحق ہیں اور تمام اردو ہندی قارئین کا شیر و شکر اجتماع بھی لائق تحسین ہے۔ محفل کے اختتام پر جناب ذاکر حبیب نے ساز پر پروفیسر مغنی تبسم کے کلام کو پیش کر کے داد و تحسین حاصل کی۔ (ڈاک سے)

شش جہت آگ

● گلبرگہ، 10ر فروری۔ ہندستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کا رنگ الگ مگر تہذیب ایک ہے۔ اردو ایک بڑی زبان ہے۔ اس کی شیرینی اور جامعیت سب پر مقدم ہے۔ اس خیال کا اظہار پروفیسر ایم وی ناڈگرنی وائس چانسلر گلبرگہ یونی ورسٹی نے کیا۔ وہ گزشتہ دنوں گلبرگہ یونی ورسٹی میں پروفیسر حمید سہروردی کے اوّلیں شعری مجموعے "شش جہت آگ" کی رسمِ اجرا انجام دینے کے بعد مخاطب تھے۔

پروفیسر حمید سہروردی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ابہام جدید شاعری کا جز ہے، یہ کہنا غلط ہے۔ ابہام تو شروع سے شاعری میں موجود ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے انھوں نے کہا میں اپنی شاعری میں آپ سے ہی مخاطب ہوں، آپ کی ہی بات کرتا ہوں۔ میں نے اس حوالے سے کائنات کو اور اللہ اور اس کے بندوں کو سمجھنے کی سعی کی ہے۔ عبدالرب استاد، صدر شعبۂ اردو جامعہ گلبرگہ نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ ممتاز شاعر محب کوثر نے تہنیتی نظم پیش کی۔ آنسہ رخسانہ سلطانہ ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ گلبرگہ نے نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے۔

(اورنگ آباد ٹائمز، اورنگ آباد)

الفاظ کی تلاش

● حیدرآباد کے معروف شاعر و ادیب جناب شاغل ادیب کے چھٹے مجموعۂ کلام "الفاظ کی تلاش" کی رسمِ اجرا زیرِ اہتمام ادارہ "میرا شہر میرے لوگ" بہ تعاون مولانا ابوالکلام آزاد، انسٹی ٹیوٹ، 14ر فروری کی شام محترمہ پروفیسر حبیب ضیا صاحبہ سابق صدر شعبۂ اردو ویمنس کالج (جامعہ عثمانیہ) کے دستِ مبارک سے انجام پائی۔ ادبی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر صادق نقوی سابق صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ نے فرمائی۔ ناظم اجلاس جناب مومن خاں شوق تھے۔ اجلاس کو جناب صدر ڈاکٹر صادق نقوی کے علاوہ پروفیسر حبیب ضیا صاحبہ، صلاح الدین نیر، کبیر احمد سابق اسٹیشن ڈائرکٹر آکاش وانی، نہپال سنگھ ورما، ہاشم حق سعید اور ثناء اللہ ثانی نے مخاطب کیا۔ تمام مقررین نے جناب شاغل ادیب کی شعری، ادبی و علمی خدمات کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ بعد ازاں ممتاز شاعر جناب رئیس اختر کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب شفیع اقبال مدیر ہفت روزہ ہماری منزل، ناظمِ مشاعرہ تھے۔ مشاعرے میں حیدرآباد و سکندرآباد کے بیس سے زائد نمائندہ شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ (ڈاک سے)

حرف حرف لہو لہو

● بیدر، 5ر مارچ۔ ممتاز صحافی جناب زاہد علی خاں چیف ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے کہا کہ اردو کسی مخصوص فرقہ کی نہیں بلکہ یہ ہر ہندستانی کی زبان ہے۔ مگر افسوس کہ اس کو صرف مسلمانوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ جناب زاہد علی خاں شاہین ہائی اسکول میں منعقدہ جناب محسن کمال سابق ایم ایل سی کے شعری مجموعے "حرف حرف لہو لہو" کی رسمِ اجرا ادا کرنے کے بعد شرکا کو مخاطب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ پچاس برسوں کے دوران تمام حکومتوں نے اردو کو اس کے جائز حق کے حصول سے محروم رکھا اور دستور میں اس کے تعلق سے دیے گئے تیقنات پر عمل آوری نہیں ہوئی چنانچہ ناانصافیوں کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جناب زاہد علی خاں نے تصویر کے دوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کو نقصان پہنچانے کے ذمّے دار اہلِ اردو بھی ہیں۔ تاہم انھوں نے پُراعتماد انداز میں کہا کہ حکومت کی جانب سے اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں اور جانبدارانہ کارروائیوں کے باوجود یہ زندہ ہے جس کے جاننے اور پہچاننے والے ساری دنیا میں موجود ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دنیا کے 107 ممالک میں اردو کے جاننے اور پہچاننے والے موجود ہیں۔ موصوف نے عابد علی خان ٹرسٹ کی جانب سے اردو زبان کی ترقی و بقا کے لیے انجام دیے جانے والے عملی اقدامات پر اظہارِ اطمینان کرتے ہوئے بتایا کہ ٹرسٹ ہذا کے تحت 450 مراکز قائم ہیں۔ جناب محسن کمال کی صحافتی خدمات کو خراج پیش کرتے ہوئے چیف ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے کہا کہ وہ موصوف کی سیاسی، سماجی یا ادبی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ ان کی صحافتی زندگی

سے متاثر ہو کر رسم اجرا کی تقریب میں شرکت کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس دور میں کتابوں کی اشاعت تو آسان ہے مگر ان کی نکاسی انتہائی دشوار کن مسئلہ ہے۔ الحاج جناب محمد لئیق الدین، ایڈوکیٹ سابق رکن اسمبلی بیدر نے ادارۂ سیاست کی جانب سے اردو زبان کی ترقی، بقا اور ترویج واشاعت کے لیے انجام دی جانے والی مخلصانہ کوششوں پر روشنی ڈالی۔ جناب آصف پاشاہ، سابق وزیر آندھرا پردیش نے محسن کمال صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ ان کے شعری مجموعے "حرف حرف لہولہو" کی رسم اجرا ایک ایسی مناسب و موزوں شخصیت کے ہاتھوں عمل میں آرہی ہے جو دنیا کے ممتاز اردو اخبار روزنامہ سیاست کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ جناب نثار احمد کلیم، محمد عبدالمقتدر اور جناب سید عبدالماجد شمیم نے محسن کمال کی شخصیت پر مقالے پیش کیے۔ ظہیر آباد کی ایک معصوم طالبہ نے موصوف کی سیاسی، سماجی، ادبی اور صحافی خدمات کو منظوم خراج پیش کیا۔ جناب بابو راؤ ایڈوکیٹ سرگاپورکر نے بھی مخاطب کیا۔ جناب عبدالوہاب عندلیب صدر کرناٹک اردو اکادمی نے صدارت کی۔ جناب اسماعیل ذبیح نے شکریہ ادا کیا۔ رات دس بجے اسی مقام پر زیر صدارت جناب رئیس اختر ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مسرس صلاح الدین نیر، ڈاکٹر نیپال سنگھ ورما، اثر غوری، شفیع اقبال، محب کوثر، فریدہ انجم اور مقامی شعرا نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ جناب محب کوثر گلبرگہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (سیاست، حیدرآباد)

تسخیر حرف

● 27؍جنوری 2002 کو انجمن ترقی اردو ہند (شاخ گلشنی) کے زیر اہتمام گلشنی (مغربی بنگال) میں معراج احمد معراج کے مجموعہ کلام "تسخیر حرف" کی رسم اجرا جناب کمال جعفری کے ہاتھوں ادا کی گئی۔ اس تقریب کی صدارت مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین جناب علقمہ شبلی نے کی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر عاصم شہنواز شبلی نے انجام دیے۔

'تسخیر حرف' غزلوں کا مجموعہ ہے جو 112 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پروفیسر علقمہ شبلی، ڈاکٹر مظفر حنفی اور کمال جعفری کی آرا شامل ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی اور ظہیر غازی پوری کے مختصر مضامین بھی اس میں شامل ہیں۔ (ڈاک سے)

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

● "ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے" نامور شاعر، ادیب و صحافی جناب صلاح الدین نیر کی ایک ایسی دستاویزی شاہکار کتاب ہے جس میں مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی خاص طور پر مشاہیر، دانشورانِ شعر و ادب کی اعلیٰ خدمات کو خراج پیش کیا گیا ہے۔ صلاح الدین نیر نے اپنی صلاحیتوں کو نہایت عمدگی اور اثرانگیز پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کے ملے جلے اثرات اُن صاحبانِ علم اور شہر کی نمائندہ شخصیتوں کے تھے جنھوں نے صلاح الدین نیر کے فکر و فن کو اپنے اپنے انداز سے پُر خلوص طرزِ خطاب سے نوازا۔ ادارہ میرے شہر میرے لوگ کی جانب سے صلاح الدین نیر کی 25ویں کتاب ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے کی رسم اجرا 5؍فروری کی شام مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ میں زیر صدارت ڈاکٹر سید عبدالمنان، صدر انجمن ترقی اُردو منعقد کی گئی تھی۔ صدر نشین انوار العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی نواب شاہ عالم خاں نے رسم اجرا انجام دی۔ اس نمائندہ ادبی تقریب میں ادب دوست حضرات اور مقررین کی خاصی تعداد نے شرکت کی۔ جناب صلاح الدین نیر نے اظہار تشکر کیا۔ جناب رئیس اختر نے ادبی اجلاس اور جناب مومن خاں شوق نے مشاعرے کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔
(ڈاک سے)

آئینۂ احساس

● دربھنگہ۔ مشتاق شمی کے افسانوں کا مجموعہ "آئینۂ احساس" کی رسم اجرا بدست بزرگ شاعر و ادیب شاداں فاروقی کے ہاتھوں 27؍فروری کو دربھنگہ میں ہوئی۔ اس جلسے میں شہر کے مشہور و معروف شعرا کرام اور ادیبوں نے شرکت کی۔ جلسے کی صدارت اویس احمد دوراں نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے عبدالعلیم ہلال، پرنسپل ملت کالج، دربھنگہ موجود تھے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے جناب مشتاق شمی کا مختصر تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد مشتاق شمی نے "بہار میں اردو افسانہ نگاری" پر ایک جائزہ پیش کیا۔ اویس احمد دوراں نے کہانیوں کی ستائش کرتے ہوئے الفاظ کی سادگی اور کہانی کے تسلسل کے حوالے سے بات کی۔ اس موقعے پر بولنے والوں میں ڈاکٹر شاکر خلیق، منظر سلیمان، جہانگیر شبنم، ڈاکٹر کمال الدین اعجاز اور کریم شوکت کے نام اہم ہیں۔ آخر میں ارشاد عالم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

صبحِ زرنگار

● ناگپور میں یک بابی ڈراموں کے مجموعے "صبحِ زرنگار" کی رسم اجرا صدر اردو مرکز لندن، عبدالغفار عزم کے ہاتھوں انجام پائی۔ یک بابی ڈراموں پر مقالات کا یہ مجموعہ ڈاکٹر محمد اسداللہ نے مرتب کیا ہے۔ اس تقریب میں ڈاکٹر سید عبدالرحیم کو صدارتی ایوارڈ سے نوازے جانے پر مہاراشٹر کے وزیر تعلیم انیس احمد نے ان کا استقبال کیا۔ جلسے کی نظامت کے فرائض پروفیسر سید یونس نے انجام دیے اور رسم شکریہ ڈاکٹر سید الیاس نے

انجام دی۔ ڈاکٹر نور السعید اختر، محمد امین الدین (مدیر ماہنامہ قرطاس)، ڈاکٹر منشاالرحمان منشا، ضیاء اللہ خاں لودھی، جسٹس سید شفیع الدین احمد، عبدالرشید خاں، ایڈوکیٹ یوا ے خان اور پروفیسر جلال الدین کے علاوہ اہل اردو کی کثیر تعداد اس تقریب میں موجود تھی۔ (ڈاک سے)

جہاندار افسر: حیات و خدمات

● حیدرآباد، 3 رفروری۔ "شہر حیدرآباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ باکمال شخصیتوں سے آباد رہا ہے جن کی شخصیت نہ صرف ریاست اور اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی معروف رہی ہے۔ ایسی ہی شخصیتوں میں جناب جہاندار افسر کی شخصیت بھی شامل ہے۔ جسٹس سردار علی خاں آج اردو گھر مغل پورہ میں جناب موسیٰ اقبال کے مقالے پر مبنی کتاب جہاندار افسر، حیات اور خدمات کی تقریب رسم اجرا سے مخاطب تھے جس کی صدارت ممتاز قانون داں جناب خواجہ محی الدین ایڈوکیٹ سپریم کورٹ نے کی اور محترمہ (ڈاکٹر) زینت ساجدہ نے اس کتاب کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ جہاندار افسر ایک مہذب اور ایک انقلابی شخصیت کا نام ہے۔ جہاندار افسر شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی جوانی میں بائیں بازو کی تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے کہا کہ آج ہماری نئی نسل اپنے اسلاف کی تاریخ سے دور ہوتی جارہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کو اسلاف کی تاریخ سے واقف کروایا جائے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ جہاندار افسر نے آصف جاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی اور وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے جناب موسیٰ اقبال کی کتاب جہاندار افسر: حیات اور خدمات پر روشنی ڈالی۔ ممتاز قانون داں رائے منوہر راج سکسینہ نے جہاندار افسر کی سیاسی، ادبی، تہذیبی، سماجی، صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ جہاندار افسر عوامی جمہوری محاذ اور اس کے بعد متحدہ شہری کمیٹی سے وابستہ رہے۔ جہاندار افسر ممتاز اردو شاعر صفی اورنگ آبادی مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں۔ انھوں نے زبانی اردو کے فروغ کے لیے جہاندار افسر کی خدمات کا تذکرہ کیا۔ پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ جہاندار افسر کے سینے میں موجود دھڑکتا دل، ہمیشہ غریب، مظلوم عوام کے لیے مضطرب رہا۔ جناب جہاندار افسر نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے جناب موسیٰ اقبال کا شکریہ ادا کیا۔ جناب خواجہ محی الدین ایڈوکیٹ نے صدارتی تقریر میں جناب جہاندار افسر حیات اور خدمات کا اعتراف کرنے پر زور دیا۔ اس تقریب کو مسرز نصرت محی الدین عبدالرحیم خاں نے بھی مخاطب کیا۔

(ساز دکن، حیدرآباد)

ناؤ، سمندر، موجیں

● 16 رفروری کو انجمن ترقی اردو سرونج اور سہ ماہی انتساب سرونج کی جانب سے لندن سے تشریف لائے ہوئے مشہور شاعر ڈاکٹر عبدالغفار عزم چیئرمین اردو ٹرسٹ اور پروفیسر آفاق احمد صاحب کا استقبال کیا گیا اور سہ ماہی انتساب کے ایڈیٹر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی گیارھویں کتاب "ناؤ، سمندر، موجیں" کا پروفیسر آفاق احمد صاحب کے ہاتھوں اجرا کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم اور پروفیسر آفاق احمد صاحب نے سیفی سرونجی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ سیفی سرونجی نے اپنی شاعری اور "انتساب" کے ذریعے سرونج کے نام کو ساری دنیا میں پہنچا کر ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انجمن ترقی اردو شاخ سرونج کے صدر محمد توفیق خاں نے پروفیسر آفاق احمد صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم کی خدمت میں بھی سہ ماہی انتساب کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ وی نرائن شرما ایڈوکیٹ اس پروگرام کی صدارت فرما رہے تھے۔ بعد میں ایک شعری نشست بھی منعقد ہوئی جس میں طالب عرفانی، ضیاء اسدی، ڈاکٹر نفیس نقی، ڈاکٹر شان فخری، مفتی محمود ندیم، سلیمان آزر اور آصف سرونجی نے اپنا کلام پیش کیا۔

ودربھ میں اردو صحافت

● ناگپور۔ بزم ادبیات اردو، فارسی اور عربی وسنت راؤنائیک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسیز ناگپور کے زیر اہتمام ڈاکٹر لطیف احمد سبحانی کی صحافتی دستاویز "ودربھ میں اردو صحافت" کا اجرا ڈاکٹر ٹی بی چودھری (اسٹیٹ ٹیچر ایوارڈ یافتہ) کے ہاتھوں انجام پایا جس کی صدارت ڈاکٹر منشاءالرحمان منشا نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر پروفیسر سید عبدالرحیم (صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ یافتہ) نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر مظہر عالم صدیقی نے انجام دیے۔ اس تقریب رونمائی میں ادبا و شعراء، پروفیسرس، ٹیچرس اور طلبہ و طالبات نیز عارف الرحمن خاں انٹر کالج ڈبیٹ کامپیٹیشن میں شریک بارہ کالجوں کے طلبہ و طالبات شریک تھے۔

ڈاکٹر ٹی بی چودھری نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مہاراشٹر میں اردو صحافت پر یہ پہلی کتاب ہے۔ مصنف کا یہ تحقیقی، تنقیدی اور ادبی لحاظ سے قابل تعریف کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالرحیم نے کہا ودربھ کا کوئی اخبار ایسا نہیں جس کا ذکر اس کتاب میں نہ کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر منشاءالرحمان خاں منشاء نے صاحب کتاب کی صحافتی بصیرت، تحقیقی خوبیوں اور لگن کو سراہا۔ پروفیسر مظہر عالم صدیقی نے کہا کہ اب تک صحافت کے موضوع بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب صحافتی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ پروفیسر معزالدین فاروقی نے اظہار تشکر کیا۔ (ڈاک سے)

جانور اور پرندہ کوئز

● مشہور سائنس ادیب عبدالودود انصاری، پرنسپل، اردو میڈیم گورنمنٹ پرائمری ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، نالی کل ضلع ہگلی کی دو کتابوں پرندہ کوئز اور جانور کوئز کی رسمِ اجرا گذشتہ 27؍جنوری بمقام رحمانیہ ہائی اسکول، آسنسول، بدست الحاج نذیر احمد یوسفی انجام پذیر ہوئی۔

جلسے کی صدارت ڈاکٹر جمیل احمد قادری، صدر شعبۂ اردو، بی بی کالج، آسنسول نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض جلیل عشرت نے انجام دیے۔ کم و بیش 350 سائنسی مضامین کے خالق جناب عبدالودود انصاری کی شخصیت اور کارناموں پر جن مقررین نے روشنی ڈالی ان میں مولانا محمد مستقیم ندوی، محمد تاشفین، ماسٹر عبدالرؤف، ڈاکٹر عابد ضمیر، ضیاء الرحمان ضیا، ڈاکٹر عشرت بیتاب، سردار رب نواز صارم، ماسٹر وصی احمد، جلال انور، تبلیغی پارہ کے نام شامل ہیں۔

(ڈاک سے)

رئیس مرزا نہیں رہے

● نئی دہلی، 19؍فروری۔ دہلی کی ثقافتی سرگرمیوں کے روحِ رواں اور صحافی رئیس مرزا کا کل رات یہاں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ رئیس مرزا امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی عمر 71 برس سے زائد تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ تارا مرزا اور بیٹی سواتی مرزا ہیں۔

مسٹر مرزا کولکتہ سے شائع ہونے والے روزنامے "عکاس" کے نئی دہلی میں نمائندہ تھے۔ وہ مدت تک قومی آواز میں ہفتہ وار ثقافتی کالم لکھتے رہے۔ وہ دہلی میں ثقافتی سرگرمیوں کے انعقاد اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़–ए उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Human Resource Development, Department of Secondary and Higher Education, Government of India
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110 066
Tel 6103938, 6103381, 6179657 Fax : 6108159 E-mail urducoun@ndf.vsnl.net.in

نوٹ:- طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

انتخاب غزلیات میر
ڈاکٹر حامدی کاشمیری
میر تقی میر کی شاعری کا منظر نامہ شخصی زندگی کی حدوں کو سمیٹتا ہوا ایک آفاقی انسانی صورت حال کو ابھارتا ہے جس میں سایوں اور روشنیوں کی ایک طلسمی دنیا آباد ہے۔
دوسری اشاعت
255 صفحات قیمت: 62؍روپے

اردو کی کہانی
سید احتشام حسین
بچوں کی تعلیمی ضروریات نیز تعلیم بالغاں کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس طرح لکھی گئی ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ ابتدا سے موجودہ دور تک ایک تسلسل کے ساتھ سامنے آ جائے۔ کتاب میں تین قلمی 61 تصویریں بھی ہیں۔
دوسرا ایڈیشن
104 صفحات قیمت: 21؍روپے

امریکی ادب کا مختصر جائزہ
ڈاکٹر سلامت اللہ خاں
انیسویں صدی سے امریکہ میں ایسا ادب تخلیق ہو رہا ہے جو اپنی بعض خصوصیات میں دوسرے ممالک کے انگریزی ادب سے مختلف ہے۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ امریکی ادب کے تاریخی اور ثقافتی سیاق و سباق کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔
دوسرا ایڈیشن
192 صفحات قیمت: 52؍روپے

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ
پروفیسر محمد حسن
ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔
پہلی اشاعت
334 صفحات قیمت: 98؍روپے

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان
ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔
پہلی اشاعت
646 صفحات قیمت: 200؍روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب
مرتب: پروفیسر محمد حسن
1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تمثیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔
پہلی اشاعت
600 صفحات قیمت 156 روپے

تبصرہ و تعارف

انسانی شخصیت کے اسرار و رموز / ساجدہ زیدی

450 صفحات، -/123 روپے
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: فیروز عالم

"انسانی شخصیت کے اسرار و رموز" اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ نفسیات کے موضوع پر لکھی گئی اس کتاب میں ادب کی چاشنی بھی موجود ہے۔ مصنفہ نے جابجا اشعار نقل کر کے نفسیات جیسے خشک موضوع کو بھی قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ اس کتاب کی مصنفہ ممتاز ماہر نفسیات و تعلیم، شاعرہ اور ناول نگار ہیں۔ اس سے قبل نفسیات پر ان کی ایک اور کتاب "شخصیت کے نظریات" بھی شائع ہو کر قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اردو میں ان موضوعات پر بے حد کم کتابیں دستیاب ہیں، پروفیسر ساجدہ زیدی قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی مبارکباد کی مستحق ہے کہ وہ گوناگوں موضوعات پر کتابیں شائع کر کے دامنِ اردو کو وسیع کرنے میں مصروف ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مصنفہ نے مختلف ماہرینِ نفسیات کی پیش کردہ تعریفوں کی روشنی میں انسانی شخصیت کی بھرپور تعریف و توضیح پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شخصیت کی تعریف پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> "شخصیت جس کی تشکیل و تعمیر میں شعور و لاشعور کی آمیزش اور آویزش ہوتی ہے، فرد کے اندر ایسے نفسی طبیعی نظاموں کی ایک پیچیدہ، مربوط اور منظم اکائی ہے جس کی بنا پر فرد کے مخصوص طرزِ حیات اور منفرد فکر و عمل کا تعین ہوتا ہے اور جو خود متحرک، تغیر پذیر اور نمو پذیر ہے۔"

عام طور پر شخصیت، کردار اور مزاج کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مصنفہ نے ان تینوں لفظوں پر تفصیلی گفتگو کر کے ان کے فرق کی نشان دہی کر دی ہے۔ ساتھ ہی شخصیت کی ساخت اور اس کے تشکیلی اجزا پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان اجزا میں انسان کے محدود عادات، امتیازی اوصاف، مخصوص رجحانات، میلانِ طبع، طرزِ حیات، بنیادی رویوں اور اقدارِ حیات کو شامل کیا گیا ہے۔ شخصیت کے تعینات کے ضمن میں مصنفہ نے ان عناصر و عوامل کا جائزہ لیا ہے جو شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اس باب میں بچے کی شخصیت کے تعین میں ماحول اور ورثے کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور خاندان، سماج، تہذیب، ثقافت، مذہب اور معاشی، سیاسی، سماجی صورتِ حال، معاشی حیثیت اور پیشہ، تاریخی عہد، جغرافیائی صورتِ حال، تعلیمی ماحول اور اتفاقی و حادثاتی واقعات زیرِ بحث آئے ہیں۔

"انسانی شخصیت کے اسرار و رموز" میں شخصیت کی نشو و نما میں حصہ لینے والے مختلف عوامل، نشو و نما کے ادوار، عہدِ قبلِ پیدائش، عہدِ شیر خواری، عہدِ طفلی، لڑکپن، عنفوانِ شباب، دورِ بلوغ اور نشو و نما کی مختلف منزلوں مثلاً دہانی منزل، برازی منزل، عضویاتی منزل، دورِ مضمری اور تناسلی دور سے واقف کرایا گیا ہے۔ شخصیت کی نشو و نما کے اہم پہلوؤں (جسمانی نشو و نما، جذباتی نشو و نما، ذہنی نشو و نما، سماجی نشو و نما، لسانی نشو و نما وغیرہ) کے متعلق بھی مصنفہ نے معلومات فراہم کی ہیں اور انسانی شخصیت کے متعلق سگمنڈ فرائڈ کی تحلیلِ نفسی، سی جی ینگ کی تجزیاتی نفسیات اور شخصیت کے سماجی و نفسیاتی تصورات (ایلفر ڈ ایڈلر، ایرک فروم، کیرن ہورنی) وغیرہ تمام نظریات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب میں فرائڈ کے نظریۂ شعور، تحت الشعور، لاشعور، اڈ، ایگو اور سپر ایگو اور سادیت و ساکیت خصوصیت سے زیرِ بحث آئے ہیں۔ سی جی ینگ کا نظریۂ اجتماعی لاشعور، دروں بیں اور بیروں بیں شخصیت، انسانی کارکردگی کے چار مختلف رجحانات، فکری، جذباتی، حسی اور وجدانی اور پرسونا کے نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نو فرائڈی تصورات میں ایلفر ڈ ایڈلر کا تصور آرزوئے برتری، ایرک فروم کا تصور آزادی، تعمیریت اور فردیت، کیرن ہورنی کا تصور تقاضائے محفوظیت اور تشویش و تصادم سے مصنفہ نے متعارف کرایا ہے۔ کتاب کے آخری دو ابواب میں انسانی تخلیق کی نفسیات اور انسانی ذات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب مصنفہ کے گہرے مطالعے، وسیع تجربات اور موضوع پر گرفت کے باعث پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ نفسیات جیسے مشکل موضوع کو انھوں نے جس خوش اسلوبی سے پرکھنے کی کوشش کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس کتاب کی کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور قیمت بھی زیادہ نہیں، اس لیے امید ہے کہ یہ قارئین میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

●

اُردو زبان کی تدریس / معین الدین

147 صفحات، -/40 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ابو ظہیر ربانی

تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت جتنی پہلے تھی اس سے کہیں زیادہ آج ہے۔ ایسے میں تعلیم کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تعلیم گاہوں میں لسانی وادبی مضامین سے طالب علموں کو روشناس کرانا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے ذہن اور فکر کو موجودہ دور کے مطابق ڈھال سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کو لسانیات کے اصول وضوابط سے واقفیت ہو۔ اردو زبان کی تعلیم و تدریس پر لکھی گئی اچھی کتابیں ناپید نہیں مگر کمیاب ضرور ہیں جس کا احساس ہر علم دوست کو ہے۔

معین الدین صاحب تقریباً چار دہائیوں سے اردو تدریس سے منسلک ہیں۔ ان کی یہ کتاب "اردو زبان کی تدریس" فنِ تدریس کے لیے ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف نے جس حسن وخوبی سے اس کام کو نئے انداز سے انجام دیا ہے، اس سے ان کی محنت، لگن اور تعلیمی تجربات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

پندرہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کا پہلا باب "زبان" پر ہے۔ اس کی تین قسموں، اشاروں کی زبان، آوازوں کی زبان اور علامتوں کی زبان کا ذکر کیا گیا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں رائج اشاروں کی زبان کی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ بولی اور زبان کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے بچوں کی شخصیت کی نشوونما میں مادری زبان کی اہمیت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا باب "تدریس اردو کے مقاصد" میں زندگی اور تعلیم میں زبان کی اہمیت وافادیت کا ذکر ہے۔ تعلیم کی چاروں منازل یعنی پرائمری، مڈل، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی کے الگ الگ تعلیمی مقاصد کی وضاحت تفصیل سے موجود ہے اور ساتھ ہی اردو تدریس کے مروجہ اغراض ومقاصد کو بڑی حد تک روایتی اور قدامت پسندانہ بتایا گیا ہے۔

تیسرے باب میں ثانوی منزل پر تدریس نثر کے مقاصد اور طریقۂ تدریس کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ثانوی مرحلے میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مقاصد ابتدائی مرحلے سے مختلف ہونا چاہئیں۔ ثانوی مرحلے میں تدریس کے سلسلے میں استاد کے لیے سب سے پہلے مقاصد کا تعین لازمی ہے۔ اس بات کی بھی ہدایت ہے کہ قواعد کو عبارت سے جدا کرکے پڑھانا مناسب نہیں بلکہ تدریس کے دوران ہی موقعے کی مناسبت سے حل کردیا جانا چاہیے۔

چوتھے اور پانچویں ابواب کا تعلق شاعری کی تدریس سے ہے۔ چوتھا تدریس نظم اور پانچواں تدریس غزل سے مختص ہے۔ دونوں کے مقاصد و مناہج میں صنفی فرق ہے۔ موصوف طالب علموں کی شخصیت کے جمالیاتی اور وجدانی پہلوؤں کو فروغ دینے کے سلسلے میں مکتبوں اور مدرسوں کے اندر شعر وسخن کی تدریس کو بہتر ذریعہ بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تدریس نظم کے لیے کوئی ایک طریقہ موزوں نہیں بلکہ اس کی کامیابی استاد کے انفرادی ذوق پر منحصر ہے۔ تدریس غزل بھی تدریس نظم سے چنداں مختلف نہیں لیکن غزل ایک دیگر طریقۂ تدریس کی متقاضی ہے۔ تدریس نظم کا آغاز ابتدائی مرحلے سے اور تدریس غزل کا آغاز ساتویں درجے سے کرنا قابل ترجیح ہے۔ نظم کے بالمقابل غزل مشکل صنف ہے اس لیے ایک استاد کا غزل کے تمام پہلوؤں سے واقف ہونا ازحد ضروری ہے۔

ایک طویل مضمون "تدریس انشا" میں موصوف نے اس صنف کی تعلیم و تعلم میں اساتذہ اور طلبہ کو پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کیا ہے اور ان کا حل بتایا ہے۔ نیز مختلف نوعیت کی انشانویسی پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتواں باب گرامر کی تدریس پر ہے جس میں ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کو گرامر سے الگ رکھنے کی ہدایت ہے۔ البتہ از ششم تا ہشتم دوران اسباق تعارفی طور پر اپنانے اور نویں جماعت سے اوپر تک ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے شاملِ نصاب رکھنے کی تاکید موصوف نے کی ہے، جس میں جدید طریقۂ تدریس اختیار کرنے کو لازمی قرار دیا ہے۔ "مطالعہ" کے زیر عنوان مصنف نے درس وتدریس میں پرائمری درجے سے اعلیٰ ثانوی درجے تک مطالعے کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور مطالعے سے متعلق ماہرین تعلیم کے مابین اختلافات رائے کو زیر بحث لاتے ہوئے دورانِ مطالعہ ملحوظ رکھے جانے والے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

تعلیم اور شخصیت کی نشوونما کے لیے درس وتدریس میں نصاب اور درسی کتب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، نویں اور دسویں ابواب میں انھی موضوعات کا احاطہ ہے۔ موصوف نے ہر سطح کی تعلیم کے لیے نصاب اور درسی کتب کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور افسوس ظاہر کیا ہے کہ اسکولوں میں جو نصاب مروج ہے، وہ بچوں کی نفسیات اور دلچسپی سے بے نیاز ہے۔ دونوں میں ربط کا فقدان ہے۔ زبان کی درسی کتب اور دیگر مضامین میں فرق ظاہر کرتے ہوئے زبان کی درسی کتب کو شخصیت کی نشوونما، شعر وادب کے ذوق اور قومی ہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرنے میں بڑی حد تک معاون بتایا ہے۔ نصاب کی تیاری میں جن باتوں کو ذہن نشین رکھنا چاہیے اور عمدہ درسی کتب میں کیا خوبیاں ہونی چاہیے ان کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

گیارھواں باب بچوں کے ادب سے تعلق رکھتا ہے جس میں بچوں کی نشو ونما کی تین منزلیں بتائی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوتی ہیں۔ بچوں کے لیے ادبی کتابیں اسی اعتبار سے مختلف ہونی چاہئیں۔ جو ادیب بچوں کے لیے کتابیں تصنیف کرتے ہیں، انھیں بچوں کی نفسیات سے واقف ہونا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی تک جو ادبی کتابیں فراہم کی گئی ہیں انھیں اطمینان بخش نہیں کیا جاسکتا۔ بارھواں باب غیر اردو داں طبقے کو اردو پڑھانے سے متعلق ہے۔ مصنف نے کچھ ایسے اصول اور طریقے بتائے ہیں جن سے ان کو اردو پڑھنا، لکھنا اور بولنا آسان ہو جائے۔ ان کا خیال ہے کہ استاد کا کام صرف تعلیم دینا ہی نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً طلبہ کی لیاقت اور صلاحیت کا جائزہ بھی لینا ہے تاکہ طالب علموں کے کمزور پہلوؤں کی اصلاح ہو سکے۔ تیرھواں باب "اندازۂ قدر" اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ باب کے آخر میں مصنف نے تحصیلی جانچ کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ چودھویں باب میں مدرسے کے طریقۂ تعلیم کو موثر اور معنی خیز بنانے کے لیے مختلف قسم کے امدادی سامانوں کی اہمیت و افادیت کا ذکر ہے۔ کتاب کا آخری باب جسے "اشاراتِ سبق" کا عنوان دیا گیا ہے، غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اشاراتِ سبق تیار کرتے وقت جن امور کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے، اس پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب انتہائی موثر اور دلچسپ ہے۔ اردو زبان کی تدریس پر جدید رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو سیر حاصل بحث کی گئی ہے اس سے کتاب کی اہمیت پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب اردو داں طبقے بالخصوص اساتذہ کے لیے نقوشِ راہ فراہم کرے گی۔

●

محمد عثمان عارف نقشبندی: ایک مطالعہ / محمد زماں عارف

160 صفحات، -/100 روپے

ناشر: راجستھان اردو اکادمی، سبھاش مارگ، سی اسکیم جے پور

مبصر: انور کمال حسینی

بظاہر محمد عثمان عارف دو متضاد شخصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک کامیاب سیاسی شخصیت تھے تو ایک مقبول اور پسندیدہ شاعر بھی۔ سیاست میں جوڑ توڑ اور موقع پرستی کی اہمیت ہے۔ شاعر کو سادہ دل اور معصوم ذہن کی شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ میں بھی یہی مانتا ہوں کہ ایک اچھا ادیب اور شاعر کبھی غیر مخلص نہیں ہو سکتا کیوں کہ اچھے ادب کی تخلیق خلوص نیت اور جذبۂ صداقت سے ہوتی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، عارف صاحب کو ایک سیاسی شخصیت سے زیادہ بطور ایک شاعر کے پذیرائی ملی ہے۔ صغیر احسنی کی اس رائے سے اتفاق ہی کیا جائے گا کہ جناب عارف میدانِ سیاست کے بھی شہسوار رہے اور ارکانِ حکومت میں بھی شامل رہے مگر نشۂ اقتدار کی عارضی سرشاری میں انھوں نے اپنے شاعرانہ احساس کا خون نہیں کیا۔ ان کی آواز کبھی اپنے ضمیر کے خلاف نہیں اٹھی اور انھوں نے اربابِ اقتدار کی کوتاہیوں کو کبھی نظرانداز نہیں کیا، اسی لیے وہ کہہ سکے:

رہبروں نے دور کردیں رہزنوں کی مشکلیں
کارواں منزل پہ لٹ جاتے ہیں آسانی کے ساتھ

زیر تبصرہ کتاب عثمان عارف کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے عثمان عارف کی نظم نگاری پر اظہار خیال کیا ہے تو ملک زادہ منظور احمد نے ان کی غزل گوئی کو پرکھا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے انھیں ایک انسان دوست شاعر بتایا ہے تو پروفیسر شجاعت علی سندیلوی نے انھیں "شاعر حسن وحیات" کے طور پر شناخت کیا ہے۔ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کا مضمون، عارف کی معتزلانہ شاعری، کا تنقیدی مطالعہ ہے تو مولانا طیش صدیقی نے ان کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ دیا شنکر کا مضمون عثمان عارف کے شعری محاسن پر گفتگو ہے تو ارشد القادری کا مضمون ان کے ایمان افروز کلام کے بارے میں ہے۔ سید غلام سمنانی نے عثمان عارف کی شخصیت اور شاعری کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا ہے تو پروفیسر قمر رئیس نے اپنے مضمون "عثمان عارف کی شاعری میں آشوب عصر اور انسان" میں ترقی پسندانہ زاویۂ نگاہ سے عارف صاحب کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جس میں شاعر کی انسانیت پرستی کو ابھارا گیا ہے۔ غرض اس تالیف کے سبھی مضامین عثمان عارف کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب جہاں عصری اردو شاعری میں ان کے رتبے کی نشاندہی میں مدد کرے گی وہیں ان کی زندگی اور شاعری پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے معتبر ماخذ بھی بنے گی۔ کتاب سفید کاغذ پر لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ سرورق عثمان عارف صاحب کی تصویر سے مزین ہے۔

●

ادراکِ معنی / محمد نفیس حسن

192 صفحات، -/125 روپے

ملنے کا پتا: 2545/1 دوسری منزل، تراہا بہرام خاں، دریا گنج، نئی دہلی-110002

مبصر: محمد نعیم

ڈاکٹر محمد نفیس حسن نے اپنی تازہ تصنیف کے آخری صفحے پر اپنا مختصر تعارف "حرفِ ناشناس" کے عنوان سے کرایا ہے۔ یہ مصنف کا انکسار ہے

ورنہ گزشتہ کئی برسوں سے اُردو کے ادبی و علمی حلقوں میں ان کے مضامین نے پذیرائی حاصل کی ہے۔

"ادراکِ معنی" ڈاکٹر محمد نفیس حسن کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اکبر کی معنویت، اقبال کی فکری و شعری جہات، اقبال اور مولانا علی میاں، رشید احمد صدیقی، مخمور دہلوی، مولانا محمد اسلم جیراج پوری، خواجہ احمد فاروقی، مشیر جھنجھانوی، مغیث الدین فریدی، ممنون حسن خاں اور گوپی چند نارنگ وغیرہ اہم مضامین ہیں جن میں ان شخصیات کی مرقع کشی دلکش اسلوب میں کی گئی ہے۔ "اُردو ادب اقدار کے تناظر میں" اور "اردو زبان و ادب کے نصابی و تدریسی مسائل" اہم معلوماتی اور فکرانگیز مضامین ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ پروفیسر نثار احمد فاروقی اور تعارف پروفیسر شمیم حنفی کے قلم سے ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ (صدر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی) کی تقریظ بعنوان "ارتکازِ فکر کی ایک مثال" کتاب کی اہمیت اور مصنف کی عرق ریزی اور اسلوب کی پختگی پر روشنی ڈالتی ہے۔

محمد نفیس حسن صاحب جو اردو کے ایک تجربہ کار اور ہر دلعزیز استاد ہیں، اپنی علمی، ادبی کاوشوں کو "طالب علمانہ" قرار دیتے ہیں۔ ایک استاد کے اس احساس کو صرف اس بنا پر قبول کیا جاسکتا ہے کہ یہ مضامین اپنے موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے علم و ادب کے طالب علموں (بالخصوص بی اے، ایم اے ریسرچ اسکالرز) کے لیے ایک خصوصی تحفہ ہے۔ اساتذہ اور ادبی ذوق رکھنے والے دیگر حضرات بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کے اس احساس پر اس تبصرے کو ختم کیا جاتا ہے "جس موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اُس میں قاری کے لیے معلومات بھی ہیں اور سامانِ انبساط بھی ہے۔ ان کی زبان صاف اور شائستہ ہے۔ فارسی سے اچھی واقفیت نے اس میں متانت و رزانت پیدا کردی ہے۔ اگر انھوں نے تحقیقی نظر سے اپنے پسندیدہ موضوعات کا مطالعہ جاری رکھا تو وہ یقیناً ہمارے علمائے متقدمین میں سے کسی کی جگہ پُر کرسکتے ہیں۔"

•

ابابیلیں لوٹ آئیں گی / ترنم ریاض

208 صفحات، -/175 روپے

ناشر: ترنم ریاض، C، جنگپورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی-110014

مبصر: وسیم بیگم

"ابابیلیں لوٹ آئیں گی" ترنم ریاض کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "یہ تنگ زمین" منظر عام پر آچکا ہے۔ زیر نظر کتاب 13 کہانیوں پر مشتمل ہے۔ کم و بیش سبھی افسانے سماج کے متوسط اور نچلے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زیادہ تر کہانیوں میں سماجی برائیوں اور معاشرتی مسائل کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ ان کی مختصر کہانیاں موضوع اور مواد دونوں اعتبار سے حقیقت سے بہت قریب ہیں۔ ان میں اگر ایک طرف وہ سچائی ملتی ہے جو ایک فنکار کو زندگی اور اس کے ماحول سے وابستہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے تو دوسری طرف فن کار کی نظر کے پینے پن کو ظاہر کرتی ہیں۔ فن پارے میں اخذ و انتخاب اور مجاز و حقیقت کی عجیب آمیزش ہوتی ہے۔ ہم اسے کسی سادہ پیمانے سے نہیں ناپ سکتے۔ مگر سادگی فن پارے کو تخلیقیت عطا کرتی ہے۔

ترنم کے دو افسانے بہت اچھے ہیں جہاں انسانی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی دو منتخب کہانیوں کا تجزیہ پیش کرنا چاہوں گی۔ پہلی کہانی ہے "باپ" جس میں انھوں نے نچلے متوسط طبقے کے باپ کے کردار کو اس کی تمام کمزوریوں اور برائیوں کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور یہاں قاری افسانہ پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیا باپ کا یہ روپ بھی ہو سکتا ہے؟ کیا باپ نشے کی حالت میں اپنی معصوم بچی کو بھی نہیں بخشتا؟ کیا اس کی نظر میں اپنے خون کی بھی کوئی حقیقت نہیں؟ معاشرے کی یہ ایک ایسی المناک اور دردناک سچائی ہے جس کو حساس ذہن فراموش نہیں کرسکتا۔

"میرا پیا گھر آیا" میں ترنم نے مرد مرکوز معاشرے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مرد ہمیشہ عورت پر ظلم کرتا رہتا ہے، اس کو حقیر سمجھتا ہے لیکن عورت ہر تکلیف کو خوشی خوشی برداشت کرتی ہے یا پھر اس کے پاس سوائے آنسو بہانے کے کوئی دوسرا چارہ نہیں ہوتا۔ عورت کی بے چارگی اور بے بسی کی تصویر کشی جو آج بھی نسوانی سماج کا مقدر ہے، اس افسانے میں کی گئی ہے۔ افسانے کا پلاٹ بہت اچھا ہے اور اس کے کرداروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کی نفسیات پر ان کی نظر گہری ہے، اس لیے کہ معاملہ تفصیلات اور جزئیات کا نہیں بلکہ اس حسیت کا ہوتا ہے جس کے ساتھ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ کتاب کا سرورق عمدہ ہے کتابت کی غلطیاں کم ہیں۔

•

درسِ حیات / منظور عثمانی

128 صفحات، -/70 روپے

ملنے کا پتا: 617 ہملٹن روڈ، کشمیری گیٹ، دہلی-6

مبصر: انور علی ایڈوکیٹ

منظور عثمانی صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک شفیق استاد ہی نہیں مصنف بھی ہیں اور طنز و مزاح کی صنف میں نثری ادب کے تخلیق کار بھی۔ ولیم ہیزلٹ نے طنز و مزاح کو Artless Art of Satire

کہا ہے۔ عثمانی صاحب کے انشائیے ان تین الفاظ پر پورے اترتے ہیں۔ لیکن طنز و مزاح کی انشائیہ تصنیفات سے زیادہ قابلِ قدر اور بامقصد ان کی شعری انتخابات پر مبنی تالیفات ہیں جو مختلف معتبر شعرا کے بامقصد معیاری اشعار کا موضوعاتی مجموعہ ہیں۔

عثمانی صاحب کی تازہ تالیف ''درسِ حیات'' حوصلہ بخش اور سبق آموز اشعار کا موضوعاتی انتخاب اور صحیح معنی میں بامقصد تالیفی کام ہے۔ منظور عثمانی نے شاعری کے بحرِ ذخار سے مختلف موضوعات پر گہر ہائے نایاب کو عرق ریزی سے چُنا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں موصوف نے اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ اردو شاعری کا عروج ہندستان میں مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی زوال کے دور میں ہوا۔ تخیلی اور خیالی محبوب کے تصور میں محصور اور مسحور اردو شاعر، زندگی کی تلخ و سنگلاخ حقیقتوں سے آنکھیں بند کیے، معاشرتی نزاع کے ماحول میں شاعری کرتے رہے۔ بقول عثمانی صاحب ''اردو غزل آنسوؤں میں غرق نظر آتی ہے۔'' لیکن مؤلف نے آزاد اور حالی کے مقصدی ادب اور نیچرل شاعری سے متاثر ہو کر ''درسِ حیات'' میں مختلف موضوعات پر ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جو نوجوانوں کو عمل کی طرف راغب کر کے ان کی کردار سازی صالح بنیادوں پر کر سکیں۔ نوجوانوں کے ذہنوں سے ''بے حسی'' اور ''بے عملی'' دور کر کے، ستاروں سے آگے جہاں بانی کی ترغیب دے سکیں۔ اس تالیف میں عزم و حوصلہ، عمل، جرأت، حق گوئی اور بے باکی، ہنر، کمال وغیرہ کے موضوعات پر مختلف شعرا کے اشعار کو ترتیب دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسرارِ ہستی، عبرت، زندہ دلی، محبت اور شعاعِ امید جیسے موضوعات پر بھی سبق آموز اشعار ملتے ہیں۔

منظور عثمانی صاحب کی یہ تالیف بامقصد شعری مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے رنگ و بو کے پھول ہیں۔ سنجیدہ ماحول میں، اور تھکن کے بعد کے تفریحی لمحات میں بھی یہ قابلِ مطالعہ ہے۔

•

چند عام بیماریاں / انل اگروال

108 صفحات، -/60 روپے

ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، A-5، گرین پارک، نئی دہلی

مبصر: ایس اے رحمن

بیماریاں زندگی کا لازمہ ہیں۔ یوں کہیے کہ زندگی اور بیماریوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نزلہ زکام، بخار، سر درد، اگزیما، سائی نس، الرجی، ایکی ڈی ٹی، ڈائیریا، قبض، گیس یہ تو وہ تکلیفیں ہیں جو بہت ہی عام ہیں اور لوگ اکثر و بیشتر ان میں مبتلا رہتے ہیں۔ انھیں عام بیماریاں ہی کہا جاتا ہے مگر ان عام بیماریوں کے بارے میں بھی لوگ کم جانتے ہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جایئے تو وہ دوا دے دے گا مگر بیماری کے بارے میں نہیں بتائے گا کہ وہ کن وجوہ سے ہوئی ہے۔ اگر ان بیماریوں کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہو جائے تو شاید بغیر دوا علاج کے ہی ہم ان بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس کتاب میں الرجی، پیٹھ کا درد، پرانٹائی ٹس، زکام، آنکھوں کی سرخی (آشوب چشم) قبض، ڈائیریا، سر درد، گلسوئے اور سائی نو سائی نس بیماریوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ان بیماریوں کے لاحق ہونے کے اسباب بتائے گئے ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کے طریقے بھی دیے گئے ہیں۔ جہاں ضروری سمجھا گیا ہے وہاں بیماری کے علاج کے لیے دوائیں بھی بتائی گئی ہیں۔ اس طرح بغیر کسی ڈاکٹر کے پاس جائے کیمسٹ سے متعلقہ دوا خرید کر اپنا علاج کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب جو دلچسپ اور حیرت انگیز حقائق سے پُر ہے، ایک ماہر طب یعنی میڈیکل ایکسپرٹ نے لکھی ہے، اس لیے اس کتاب میں دیے گئے طریقہ ہائے علاج اور مجوزہ دواؤں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر انل اگروال مولانا آزاد میڈیکل کالج میں استاد ہیں۔ ترجمہ ادریس احمد خاں نے کیا ہے جو بہت رواں ہے۔ ایسی معلوماتی کتابیں اردو میں کم شائع ہوتی ہیں اس لیے اہم کتابوں کی طرح ان کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ کتاب لیزر کمپوزنگ میں سفید کاغذ پر صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے پاپولر سائنس سیریز کی یہ کتاب اردو مطبوعات کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

•

ماہنامہ ''امکان'' / مدیر: ملک زادہ منظور احمد

98 صفحات، -/150 روپے

ملنے کا پتا: ماہنامہ ''امکان'' سیمانت نگر، کنچن بہاری مارگ، لکھنؤ

مبصر: مخمور سعیدی

لکھنؤ اردو شعر و ادب کا گہوارہ ہے اور اب بھی ہے لیکن ماہنامہ ''کتاب'' کے بند ہو جانے کے بعد جس کے مالک و مدیر عابد سہیل تھے اور جس نے اردو کی ادبی صحافت میں اپنی ایک ممتاز جگہ بنائی تھی، وہاں سے پھر کوئی قابلِ ذکر ادبی رسالہ شائع نہیں ہوا۔ ماہنامہ ''نیا دور'' ادبی رسالہ ہے لیکن وہ سرکاری وسائل سے سرکاری انتظام میں شائع ہوتا ہے اور بہت سے ادبی مباحث ایسے ہو سکتے ہیں جن کی گنجائش اس کے صفحات پر نکلنا مشکل ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کو داد دی جانی چاہیے کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود (وہ اردو تحریک کے قائدین میں بھی ہیں اور مشاعروں کے مصروف ترین ناظم بھی) اس کمی کو محسوس کیا اور اس کی تلافی کا بیڑا اٹھایا۔

"امکان" کے اب تک تین شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ زیر نظر شمارہ اس کا تیسرا شمارہ ہے۔ مشمولات کی نوعیت دوسرے ادبی رسائل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں؛ مضامین، نظمیں، غزلیں، تراجم اور قارئین کے خطوط، لیکن پیشکش کا انداز مختلف بھی ہے اور منفرد بھی جس سے مرتبین کی اپنے ادبی کوائف سے مکمل آگاہی کا بھی اظہار ہوتا ہے اور رکھ رکھاؤ اور سلیقے کا بھی۔ مختلف اصناف ادب کو جن مختلف عنوانات کے تحت جگہ دی گئی ہے، ان سے بھی مرتبین کی ادبی بصیرت کا سراغ ملتا ہے۔ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جنھیں اس رسالے کا امتیاز کہا جاسکتا ہے۔ جو لوگ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں، یادوں میں ان کی بازدید، پاکستان کے مشہور شاعر، ادیب اور اخبار نویس محمود شام کے ناول "شب بخیر" کے اقتباسات کی قسط وار پیشکش، جس کی ذمے داری پرویز ملک زادہ نے اپنے سر لی ہے اور ہمعصر ادیبوں کی شخصیتوں اور ان کے ادبی کاموں پر انور ندیم کا اظہار خیال جو انتہائی دلچسپ تو ہے ہی لیکن جس کے پیچھے گہرے غور و فکر کی کارفرمائی بھی صاف محسوس کی جاسکتی ہے ـــ ادبی رسائل کے قدر دانوں کی طرف سے اس رسالے کا پرجوش خیر مقدم ہونا چاہیے۔

•

حصار / نصرت رشید

96 صفحات، -/150 روپے

ملنے کا پتا: محبوب آباد، حول، سری نگر

"حصار" محترمہ نصرت رشید کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1998 میں شائع ہوا۔ اس میں نظمیں اور چند غزلیں شامل ہیں۔ بقول حامدی کاشمیری "حصار ان کی ذہنی کیفیات کی رنگارنگی کا آئینہ ہے۔ یہ وہ حصار بھی ہے جو مردوں نے عورت کے گرد کھڑا کر رکھا ہے اور جس سے نکلنے کے لیے عورت صدیوں سے جدوجہد کرتی رہی ہے۔" ایک نظم "شہید" ملاحظہ ہو:

اسکے کپڑوں اور چہرے / پر خون کے دھبے تھے / وہ ان دشمنوں کی بلائیں لیتی تھی / اور اسکے چہرے کو / اپنے آنچل میں چھپادیتی تھی / اس کا بیٹا / چند لمحے پہلے / پھولوں کے تعاقب میں گیا تھا / وہ بیچ رستے میں لہو لہان ہوا / اور لوگ / اسکے لہو کا نظارہ کر رہے ہیں۔

•

سونے کا محل / انور کمال حسینی

96 صفحات، -/35 روپے

ناشر: ملٹی پبلی کیشنز، 1669، کوچہ دکھنی والے، دریا گنج، نئی دہلی-110002

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں "انور کمال حسینی اردو کے کہنہ مشق ادیب ہیں۔ زندگی بھر وہ قومی سطح کے شہرہ آفاق ادارے نیشنل بک ٹرسٹ سے بطور مدیر اردو وابستہ رہے، جہاں انھوں نے ہندستانی ادبیات اور بچوں کے لیے سیکڑوں کتابیں شائع کیں اور ترجمہ کرائیں۔ انھیں بچوں کی ضروریات اور ان کی نفسیات کا پورا پورا اندازہ ہے۔ وہ ناول اور کہانیاں بھی لکھتے رہے ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی اور دوسرے اشاعتی اداروں کے لیے بھی خاصا کام کیا ہے۔ اب انھوں نے بچوں کے لیے آسان زبان میں دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں جو امید ہے کہ مقبول ہوں گی اور ہاتھوں ہاتھ لی جائیں گی۔"

کتاب میں 12 کہانیاں شامل ہیں جن کے عنوانات ہیں:

"پرچوں کی تلاش"، "چوری پکڑی گئی"، "پہلے کیا؟"، "شہزادی شیریں"، "نمک کا تھیلا"، "بہادر جاوید"، "سونے کا محل"، "غرور کا نتیجہ"، "سچائی کا پھل"، "جادو کا کھلونا"، "باز بہادر"۔

□□□

جوابات : قبائل (کوئز) :

1-الف	2-د	3-ج	4-ب	5-ب	6-الف	7-الف	8-ج	9-ب	10-الف
11-ج	12-ج	13-الف	14-ج	15-ب	16-د	17-ج	18-الف	19-ب	20-الف
21-ج	22-ج	23-د	24-الف	25-د	26-الف	27-ب	28-ج	29-ب	30-الف
31-ب	32-ب	33-ب	34-ج	35-ب	36-ب	37-الف	38-ج	39-د	40-ب
41-ج	42-ب	43-الف	44-ب	45-ج	46-ب	47-الف	48-ج	49-الف	50-ج

عطا عابدی

بچوں کا گوشہ

اختر کی پنسل

اختر دسویں درجے میں پڑھتا تھا۔ سلیم اس کا ہم جماعت تھا اور اس کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے۔ اسکول میں حساب کی گھنٹی میں اختر اپنے بستے سے پنسل نکالنے لگا۔ لیکن اُسے سخت حیرانی ہوئی کہ وہاں پنسل تھی ہی نہیں۔ اختر پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا، آخر اُس کے بستے سے کس نے پنسل نکال لی؟ اس نے مجبوراً پنسل کا کام قلم سے کیا، حالانکہ اس کے لیے استاد کی سرزنش بھی سہنی پڑی۔

حساب کے کلاس کے بعد وقفے کی گھنٹی بجی۔ اس نے آس پاس دیکھا تو بغل میں بیٹھا ہوا سلیم موجود نہیں تھا۔ غالباً وہ حساب کے استاد کے نکلتے ہی باہر نکل گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اختر کو یہ سوچتے دیر نہ لگی کہ اس کے بستے سے اسی نے پنسل نکالی ہو گی اور اب اسے چھپانے کے لیے فوراً باہر نکل گیا ہے۔ اُسے حیرت تھی کہ سلیم سے کسی کو اس طرح کی شکایت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ سلیم نے اسی لیے یہ حرکت کی ہو گی کہ اُس پر کسی کو شک نہ ہو گا۔

اسی ادھیڑ بن میں اختر باہر نکلا۔ کھیل کے میدان میں کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ درختوں کے نیچے کچھ لڑکے چاٹ اور کچھ مونگ پھلی لے کر کھا رہے تھے۔ ایک دوسری جگہ آئس کریم والوں کے ارد گرد کچھ بچے جمع تھے تو کچھ اپنی اپنی ٹولیوں میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اختر کی نگاہ سبھی جگہ سلیم کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن سلیم کا کہیں پتا نہ تھا۔ اختر کو یقین ہو گیا کہ اس کی پنسل سلیم نے ہی چرا لی ہے ورنہ ہر دن اس کے ساتھ کھیلنے والے سلیم کو آج کیا ہو گیا۔

وقفہ ختم ہوا۔ سبھی لڑکے اپنے اپنے درجے میں پہنچے۔ اختر کی نگاہ اب بھی سلیم کو ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن سلیم اپنے درجے میں اُس وقت پہنچا جب استاد بھی آ گئے۔

اختر نے سلیم پر اچٹتی نظر ڈالی۔ اس کی پریشان صورت دیکھ کر اختر کا شک مزید پختہ ہو گیا۔ اختر کا دل اب پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ اُسے بس یہ فکر ستا رہی تھی کہ چھٹی کے بعد سلیم کو وہ کس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے گا۔

چھٹی ہوئی تو سبھی لڑکے خوشی میں جھومتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوئے۔ اختر نے دیکھا سلیم ان میں نہیں تھا۔ اسکول سے باہر نکل کر آگے نظر ڈالی تو سلیم تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ اب اس کو پکا یقین ہو گیا کہ پنسل سلیم نے ہی لی ہے ورنہ سلیم کبھی اس طرح گھر نہیں جاتا تھا۔ وہ تو اس کے علاوہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ ہی گھر جاتا تھا۔

آج چوری پکڑے جانے کے ڈر سے وہ ساتھیوں کو چھوڑ کر اکیلا گھر بھاگا جارہا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ گھر جاتے ہی ابو سے سلیم کے پنسل چرا لینے کی بات کرے گا اور اس کے گھر جا کر سلیم کے بستے سے وہ اپنی پنسل نکال کر اسے چور ثابت کر دے گا۔ اختر نے اپنے ساتھیوں سے بھی سلیم کی آج کی حرکتوں کا ذکر کیا۔ سب نے سن کر سلیم کو پنسل چور قرار دیا۔

اختر گھر پہنچا تو اس کے ابو دفتر سے نہیں لوٹے تھے۔ اس کی بے چینی امی سے چھپی نہ رہ سکی۔ امی نے آخر پوچھ ہی لیا" کیا بات ہے بیٹے؟ آج کچھ پریشان لگ رہے ہو؟"

"ہاں امی! آج سلیم نے میرے بستے سے پنسل چرا لی۔ پنسل نہ ہونے کے سبب حساب کے استاد سے ڈانٹ بھی سننی پڑی۔"

ماں کچھ اور پوچھنے ہی والی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ امی نے دروازہ کھولا۔ اختر کے ابو دفتر سے آگئے تھے۔

اختر نے ابو کے گھر میں قدم رکھتے ہی انھیں پنسل کی چوری کا واقعہ سنا دیا۔ ابو یہ سن کر اپنے پڑھنے لکھنے کی میز پر گئے اور اختر کی پنسل اختر کے حوالے کر دی۔ انھوں نے بتایا کہ آج صبح ان کو ضرورت پڑی تو وہ اس کے بستے سے پنسل نکال کر کام کرنے لگے تھے پھر وہ پنسل بستے میں رکھنا بھول گئے۔ اختر اپنی پنسل مل جانے کے باعث آج ذہنی تناؤ سے آزاد ہو گیا تھا۔ مگر ایک خلش اب بھی اس کے دل میں تھی۔ آخر سلیم کی حرکتیں آج ایسی کیوں تھیں؟ وہ اپنی اس خلش کا اظہار کرتا، اس سے پہلے ہی ابو نے پوچھا—

"آخر تم نے سلیم پر ہی پنسل کی چوری کا الزام کیوں لگایا۔"

اختر نے اس کے جواب میں وقفے کی گھنٹی سے لے کر چھٹی تک کی سلیم کی کارکردگی بیان کر دی۔ یہ سن کر ابو نے کہا— بیٹے! جب کسی سے کسی طرح کی بدگمانی ہو جاتی ہے تو اس کی ہر سرگرمی مشکوک نظر آتی ہے۔ اب بتاؤ کہ پنسل تو سلیم نے چرائی نہیں لیکن بدگمانی ہوتے ہی اس کے تمام افعال مشتبہ ہو گئے اور تم ذہنی طور پر پریشان رہے۔"

"ابو! آخر سلیم نے آج اس طرح۔۔۔۔"

"۔۔۔ ضرور کچھ بات ہو گی بیٹے۔ اگر تمھارے دل میں بدگمانی نہ آتی تو یقیناً تم کو اس کے عمل سے ہمدردی ہوتی اور تم اس کے گھر جا کر معاملے کا پتا لگاتے۔ لیکن تم نے تو بغیر کسی ثبوت کے اسے پنسل چور مان لیا۔ اب تم سلیم کے گھر جا کر دیکھو، یقیناً کوئی خاص بات ہو گی۔"

"ہاں ابو، میں جاتا ہوں۔"

اختر سلیم کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی ماں بیمار ہے اور وہ دوا لانے گیا ہوا ہے۔ اس نے وہیں بیٹھ کر سلیم کا انتظار کیا۔ سلیم جب آیا تو اسے سلام کیا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ماں کو دوائیں دینے لگا۔ سلیم کا ماں کے سوا گاؤں میں کوئی نہ تھا۔ والد

دہلی میں ملازمت کرتے تھے اور خاص خاص مواقع پر ہی گھر آپاتے تھے۔ یعنی ماں کی خدمت سے لے کر سودا سلف تک لانے کا کام اسی کے ذمے تھا۔ سلیم ماں کو دوائیں دے کر فارغ ہوا تو اختر سے مخاطب ہوا— ''کہو اختر، کیسے آنا ہوا؟''

اختر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے کہا— ''آج اسکول میں وقفے کے وقت اور پھر چھٹی کے بعد بھی تم مجھ سے اور دوسرے ساتھیوں سے الگ تھلگ رہے تو سوچا کہ گھر چل کر پوچھوں کیا بات ہے؟''

سلیم نے کہا— ''دراصل ماں بیمار تھی، اس لیے آج دیر سے اسکول پہنچا۔ اسکول میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا، اس لیے وقفہ ہوتے ہی ماں کو دیکھنے گھر آگیا اور پھر اسکول گیا۔ اسی سبب سے وقفے کے بعد کی کلاس میں بھی کچھ دیر سے پہنچا۔ چھٹی ہوتے جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا کہ ماں کے لیے دوائیں بھی لانی تھیں۔''

یہ سن کر اختر آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے سلیم سے معافی مانگی اور اپنی بدگمانی کی داستان سنادی۔ اختر کے رویے سے سلیم بھی پگھل گیا اور بولا۔ ''میرے دوست! اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ تمھاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو غالباً اسی طرح سوچتا۔ آئندہ کے لیے ہم لوگوں کو ایک بڑا سبق ملا ہے کہ بدگمانی میں ساری چیزیں مشکوک ہو جاتی ہیں، ہر عمل ایک سازش محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں آپس میں خوش گمان ہونا چاہیے تاکہ شک و شبہ کی جگہ اعتبار و اعتماد قائم ہو سکے۔''

سلیم کی باتیں سن کر اختر کو ایسا لگا جیسے سر سے ایک بڑا بوجھ ٹل گیا ہو۔

اختر اب اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ رات کی تاریکی گہری ہوتی جارہی تھی لیکن اس کا دل و دماغ فرحت بخش روشنی میں نہایا ہوا تھا۔

❑❑❑

Administrative Officer
Urdu Department. Bihar Vidhan Parishad, Patna-800015 (Bihar)

آندھی میں چراغ

خواجہ غلام السیدین

مصنف کا ماننا ہے کہ ''ہر انسان ایک انمول شخصیت کا امین ہے اور اس کی نشوونما اور پوشیدہ صلاحیتوں کی تربیت فرد اور جماعت دونوں کا فرض ہے۔'' یہ کتاب شخصی اور واقعاتی حوالوں سے اسی اجمال کی تفصیل پیش کرتی ہے۔

دوسرا ایڈیشن

376 صفحات　　قیمت: 73 روپے

انسانی شخصیت کے اسرار و رموز

پروفیسر ساجدہ زیدی

علم النفسیات کا سب سے اہم پہلو شخصیت کی نفسیات ہے۔ اس کتاب میں انسانی شخصیت کے کرداری، تحریکی، جبلی، فعلی اور امکانی عناصر اور ان کی نمو پذیر شخصیت کی پردہ کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی اشاعت

456 صفحات　　قیمت: 123 روپے

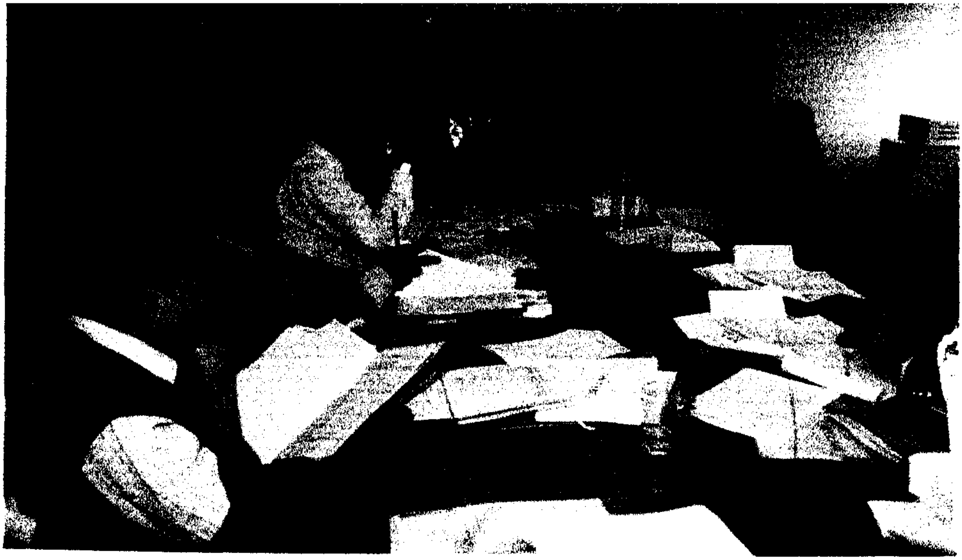

گرانٹ ان ایڈ کمیٹی (اردو) کی میٹنگ 5/مارچ 2002 کو جناب من موہن شرما کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب من موہن شرما، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، جناب ٹی آر پرساد، جناب اے کے قاسم (AFA) وزارت ترقی انسانی وسائل۔

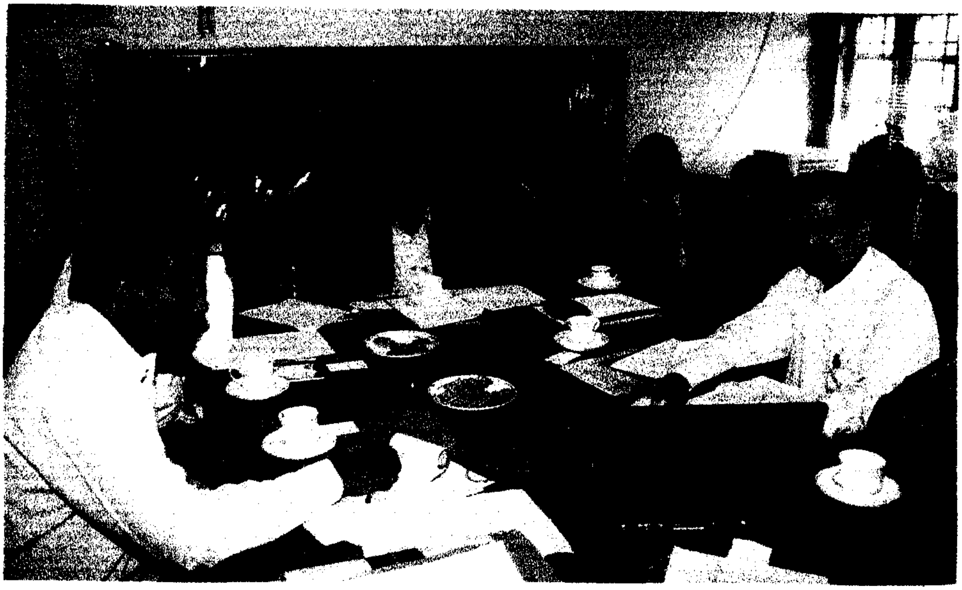

یکم مارچ کو C-DAC پروجیکٹ کی مانیٹرنگ کمیٹی کی میٹنگ قومی اردو کونسل کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ تصویر میں (دائیں سے) جناب ایم ڈی کلکرنی (C-DAC، پونے)، پروفیسر بی بی چودھری (ISI کولکاتہ)، جناب وجے گپتا (CEO Concept Softwares)، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور ڈاکٹر اے آر فہمی (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر)

RNI No. 70323/99 DL-15052 / 2002

URDU DUNIYA Monthly, April 2002, Vol. 4, Issue: 4

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکمہ ثانوی واعلا تعلیم، حکومت ہند، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فلسفہ سائنس اور کائنات

مصنف: ڈاکٹر محمود علی سدنی

انسان کائنات کے اسرار و رموز جاننے کا ہمیشہ متمنی رہا ہے، سائنس بھی انھی اسرار و رموز کو جاننے کا وسیلہ ہے جو صدیوں کے انسانی غور و فکر کا حاصل ہے۔ ایک اہم موضوع پر ایک اہم کتاب۔

ڈیمائی صفحات 296، قیمت -/55 روپے

ابتدائی نفسیات

مصنف: سید محمد محسن

اس کتاب میں اساسی حقائق اور نظریات کے پس منظر میں زندگی کی حقیقی صورت حال پر نفسیاتی علوم کے اطلاقی اصول عام فہم انداز میں واضح کیے گئے ہیں۔

ڈیمائی صفحات 240، قیمت -/61

(دوسرا ایڈیشن)

ابنارمل نفسیات

مصنف: ریفریم روزن

ترجمہ: ذکیہ مشہدی

موجودہ میکانکی دور میں آدمی جس ذہنی کشمکش، تناؤ اور تعصب کا شکار ہے اس کے نتیجے میں وہ غیر معمولی نفسیاتی صورت حال سے کسی بھی وقت دوچار ہوسکتا ہے۔ کتاب میں اس صورت حال پر علمی گفتگو کی گئی ہے۔

ڈیمائی صفحات 308، قیمت -/72 (دوسرا ایڈیشن)

مغل ہندستان کا طریق زراعت

مصنف: عرفان حبیب

مغل دور کے بہت سے پہلوؤں پر لکھا گیا ہے۔

یہ کتاب اس دور کے طریق زراعت پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔

ڈیمائی صفحات 599، قیمت 119 روپے

(دوسرا ایڈیشن)

ہندستان کی قبائلی عورتیں

مصنف: ڈاکٹر شیام سنگھ ششی

ہندستان کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والی قبائلی عورتوں کو مہد سے لحد تک پیش آنے والے حالات و واقعات۔ ہندستان کی قبائلی زندگی کا رنگارنگ مرقع۔

ڈیمائی صفحات 239، قیمت 26 روپے

آسان اردو شارٹ ہینڈ

مصنف: سید ارشد حسین

مختصر نویسی اس دور کی اہم ضرورت ہے۔

اس فن کو سیکھنے اور سکھانے والوں کے لیے

یہ کتاب ایک رہنمائی طرح ہے۔

ڈیمائی صفحات 151، قیمت چالیس روپے

(دوسرا ایڈیشن)

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel : 6103381, 6103938